إِنۡ أُرِيۡدُ إِلَّا الۡإِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

نومبر ۲۰۱۰ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۵، شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۱۰ء

مشمولات

خسارے کی سرمایہ کاری	مدیر	۲
○ہمارا دینی تناظر		
فرقہ وارانہ دہشت گردی کی مذمت	ملی مجلس شرعی	۳
جہاد اور مسلک پرستی	خالد جامعی	۵
حضرت عائشہؓ کے حق میں امام خامنائی کا فتویٰ	سید منصور آغا	۷
○یادرفتگان		
ڈاکٹر محمود احمد غازی —— چند یادیں، چند باتیں	ڈاکٹر محمد امین	۱۰
○تعلیم و تربیت		
ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ	مدیر	۱۶
○میڈیا		
میڈیا — رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق	ڈاکٹر محمد امین	۲۶
○تزکیہ		
اکتساب فضائل (۳)	علامہ احمد جاوید	۴۵
انسانی فکر و عمل میں قلب کا بنیادی کردار (۲) تازہ ترین مغربی سائنسی تحقیق	ڈاکٹر گوہر مشتاق	۴۹
○تفہیم مغرب		
مغربی فکر کی اساسیات (۳)	مدیر	۵۳
○مدیر کے نام	ادارہ	۵۶

خسارے کی سرمایہ کاری

ہم نے ایک مہربان سے، جو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے کاموں میں ہم سے مالی تعاون فرماتے ہیں، مشورہ کیا کہ ہم پرچہ نکالنے کی سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا 'اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ پرچے بہت ہیں پڑھتا کوئی ہے نہیں'۔ ہم نے سوچا چونکہ وہ ٹرسٹ کی مالی معاونت فرماتے ہیں اس لئے انہیں حق ہے کہ سوچیں کہ ٹرسٹ کا پیسہ صرف مفید اور مؤثر کاموں میں صرف ہو۔ چنانچہ ہم نے اگلی ملاقات میں عرض کیا کہ ہم اس پرچے پر ٹرسٹ کا پیسہ نہیں لگائیں گے بلکہ یونیورسٹی سے ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے اس میں سے کچھ کھینچ تان کر پرچہ نکالیں گے۔ کہنے لگے میری رائے پھر بھی وہی ہے۔

ہم چونکہ ان کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے کے قائل ہیں لہٰذا سمجھ گئے کہ عقل کی بات وہی ہے جو وہ کہہ رہے ہیں ــــ لیکن ہم اپنے جنوں کا کیا کریں جو کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا چنانچہ جب دیوانگی فرزانگی پر غالب آ گئی تو ہم نے البرہان جاری کر دیا۔

سو جناب! منافع کی سرمایہ کاری تو سب کرتے ہیں ــــ اور وہی کرنی چاہئے لیکن جب مقصد کی لگن انتہا کو پہنچ جائے اور دیوانگی فرزانگی پر غالب آجائے تو کچھ لوگ خسارے کی سرمایہ کاری بھی کر لیتے ہیں۔

یہ عشق بھی عجیب چیز ہے۔ عرصہ ہوا ایک عربی قطعہ پڑھا تھا کہ کسی نے دیکھا کہ مجنوں دیواروں کو بوسے دیئے جا رہا ہے۔ اس نے پوچھا میاں قیس! یہ کیا کر رہے ہو؟ 'دیوانے' نے ایک لحظہ کو آنکھیں اٹھائیں اور معصومیت سے کہا 'تمہیں نہیں پتہ یہ لیلیٰ کے گاؤں کی دیواریں ہیں'۔

امین

ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے

فرقہ وارانہ دہشت گردی کی مذمت

ملی مجلس شرعی کے اجلاس مورخہ ۹ نومبر ۲۰۱۰ء میں تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے درج ذیل قرارداد منظور کی ہے:

''ہم ملک کے طول وعرض میں ہونے والی دہشت گردی کی تمام وارداتوں کی پرزور مذمت کرتے ہیں بالخصوص مساجد اور اولیاء اللہ کے مزارات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ بے حد قابل مذمت ہے۔ ان مقدس اور روحانی مقامات پر دہشت گردی کرنے والوں کا دین و مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ہم اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ہمیں اس صورتحال کا متحد ہو کر مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ باہمی انتشار و افتراق سے ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمام مکاتب فکر کی جگ ہنسائی ہوگی جب کہ اسلام دشمن طاقتوں کو اس سے تقویت ملے گی۔

ہمارا ماضی سب کے سامنے ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، ناموس رسالتؐ کے تحفظ اور نفاذِ اسلام کے لئے تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام نے ہر مرحلہ پر متحد ہو کر ملت کی قیادت کی ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ اور قومی خودمختاری کی بحالی کے لئے شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے اور اسی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہم مشترکات پر متحد رہنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم مشترکہ طور پر عوام سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت کو ہوا نہ دیں اور آپس میں محبت و مودت اور یگانگت کو فروغ دیں''۔

اس قرارداد پر مجلس میں موجود جن علماء کرام نے دستخط ثبت فرمائے ان میں مولانا زاہد الراشدی صاحب (جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)، مولانا ملک عبدالرؤف صاحب (متحدہ

علماء کونسل)، مولانا خلیل الرحمن قادری صاحب (جامعہ اسلامیہ لاہور)، مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب (جامعہ رحمانیہ گارڈن ٹاؤن)، مولانا قاری جمیل الرحمن اختر صاحب (جامع مسجد امن باغبانپورہ)، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی صاحب (جامعہ اہل حدیث نشتر روڈ)، حافظ عاکف سعید صاحب (امیر تنظیم اسلامی)، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ صاحب (جماعت اسلامی)، پروفیسر نذیر احمد بھٹی صاحب (جامعہ صدیقیہ بہاولپور)، مولانا ابو رجال (جامعہ اہلحدیث) اور ڈاکٹر محمد امین صاحب (تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ) شامل ہیں۔

جبکہ مجلس کے دیگر رہنماؤں خصوصاً مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب (جامعہ اسلامیہ لاہور)، علامہ احمد علی قصوری صاحب (مرکز اہلسنت)، مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب (جامعہ اشرفیہ)، مولانا قاری احمد میاں تھانوی صاحب (جامعہ دارالعلوم اقبال ٹاؤن) اور مولانا عبدالمالک صاحب (جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ) نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی ہے۔

....

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

خالد جامعی

جہاد اور مسلک پرستی

غلبۂ اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نفاذ اور توسیع کی چوکھی جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے جو تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزر چکے ہوں اور اپنی ذات کو مٹا چکے ہوں۔ وہ لوگ جو مومن کا مقام حاصل کرنے کے بجائے ایک فرقہ پسند گروہ بن کر گروہی عصبیت کے حامل ہوں اور مشرکین، کفار، اہل کتاب اور اسلامی گروہوں کے مابین فرق کرنے سے معذور ہوں وہ جہاد کے اہل نہیں۔ جہاد میں اگر کافر چمکتی تلوار دیکھ کر اسلام قبول کرلے تو اس کا اسلام قابل یقین ہوجاتا ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں کہ جب اس کافر نے کلمہ پڑھ لیا تو تم نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا تھا۔ گمان یہ تھا کہ دھوکہ دے رہا ہے تو فرمایا کیا تم نے اس کا سینہ کھول کر دیکھ لیا تھا؟ حضرت علیؓ مرحب پہلوان کو گراتے ہیں لیکن اس کے تھوکنے پر اٹھ کر الگ ہوجاتے ہیں کہ پہلے میں اللہ کے لئے لڑ رہا تھا اب گمان ہوا کہ کہیں اپنے نفس کے لئے یہ کوشش نہ ہو۔ میدان جہاد میں ایک صحابی نے جن کا وقت شہادت قریب تھا پیاس کی شدت سے پانی طلب کیا۔ پانی پیش کیا گیا اتنے میں دور سے آواز آئی کہ پانی تو پانی چھوڑ دیا اور اشارہ کیا کہ انہیں پہلے پانی پلا دو۔ وہ دوسرے صحابی کے پاس پہنچے تو تیسرے کی آواز آئی۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ انہیں پانی پلاؤ۔ ادھر گئے تو وہ شہید ہوچکے تھے۔ لوٹے تو پہلے اور دوسرے صحابی بھی شہید ہوچکے تھے۔ جو لوگ قربانی و ایثار کے اس درجے پر فائز ہوں کہ موت کی سختی اور پیاس کی طلب بھی انہیں اپنے بھائی کی محبت سے غافل نہیں کرتی وہی مجاہد کے مرتبے پر فائز کیے جانے کے لائق ہیں۔ سورہ حشر کی آیت وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ [۵۹:۹] انہی نفوس کی شان میں اتری ہے۔ یہ وہ مجاہد ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے اپنے قلم سے ایمان ثبت کردیا

ہے۔ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ [۲۲:۵۸] جہاد کے لئے اس ایمان، یقین اور کردار کی ضرورت ہے اگر کوئی اس سے محروم ہے تو اپنے آپ پر اور اس امت پر رحم فرمائے اورمیدان جہاد کی بجائے اپنے گھروں میں آرام کرے۔ جو لوگ تزکیہ نفس کے اس مقام پر ہوں وہی جہاد کے اہل ہیں اور جو لوگ انتقام اور ردعمل کی سطح سے اوپر ہی نہیں اٹھے وہ لشکر جہاد میں شامل ہونے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

جہاد ایک نورانی و روحانی عمل ہے۔ یہ زمین پر قبضہ کرنے، سروں کے مینار کھڑے کرنے اور تسخیر فی الارض کے لئے نہیں یہ تسخیر قلوب انسانی کے لئے آیا ہے۔ اسی لئے دعوت اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جہاد سے دعوت میں توسیع اسی وقت ممکن ہے جب مجاہد کمال ضبط کے مقام پر کھڑا ہو اور میدانِ جنگ میں بھی غیض وغضب سے مغلوب نہ ہو۔ کسی کو قتل کرنا اور فناء کے گھاٹ اتارنا اس کے اختیار میں ہو لیکن اللہ کی خاطر وہ اس اختیار کو ترک کردے۔ ضبط نفس کا یہ مقام اگر آجائے تب یہ جہاد اور چمکتی ہوئی تلواریں میدان دعوت بھی بن جاتی ہیں۔ اسی لئے دین کا مقصد قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے دعوت کا فروغ اور توسیع ہے۔ اسی لئے دین صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے لیکن اگر اہل دین پر جنگ مسلط کی جائے تو وہ بھرپور مقابلے کا حکم دیتا ہے کہ کفر کی قوت اور شان وشوکت کو توڑ دیا جائے اور زمین کو فتنہ وفساد سے پاک کر دیا جائے۔

....

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (الفتح ۲۹:۴۸)

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

سید منصور آغا

حضرت عائشہؓ کے حق میں امام خامنائی کا فتویٰ

اسلامی جمہوریۂ ایران کے دینی سربراہ سید علی خامنائی نے ۳ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ایک فتویٰ جاری کیا ہے جس میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور اصحاب رسول (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی شان میں گستاخی کو حرام قرار دیا ہے۔ اس فتوے کا عالم اسلام کے ممتاز شیعہ وسنی علماء اور دانشوروں نے پُر جوش خیر مقدم کیا ہے۔ الاحساء کے علماء اور دانشوروں نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اگست ۲۰۱۰ء میں ان سے استفسار کیا تھا کہ ''ایک ایسے دور میں جبکہ امت اسلامی ایک منظم بحران سے گزر رہی ہے، مسلمانان عالم کے درمیان تفرقہ اور انتشار پھیل رہا ہے اور وحدت امت کی ترجیحات کو نقصان پہنچایا جارہا ہے جس کی وجہ سے حساس معاملات کو حل کرنے کے لئے جاری اسلامی جدوجہد اور اس کے ثمرات سے توجہ ہٹ رہی ہے۔ ایسے نازک دور میں کچھ لوگ انتہا پسندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ارادی طور پر سنی ملت کی علامتوں اور مقدسات کی مسلسل توہین ہورہی ہے۔ اسی سلسلے کے تحت بعض سیٹلائٹ چینلز اور انٹرنیٹ ویب سائٹس پر علم و دانش سے منسوب بعض افراد کی جانب سے زوجۂ رسول حضرت عائشہؓ کے بارے میں ایسے نازیبا الفاظ کہے جارہے ہیں جن سے ان کی صریح اہانت ہوتی ہے اور جواز واج نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امہات المومنین کے شرف کے خلاف ہیں''۔ اس بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

اس استفسار کا پس منظر یہ ہے کہ کویت کے ایک سابق فوجی افسر شیخ یاسر الحبیب نے، جو خود کو شیعہ مبلغ و عالم باور کراتا ہے اور برطانیہ میں خود جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے، ماہ رمضان سے متعلق ایک مقدس اجتماع میں حضرت عائشہؓ کے خلاف انتہائی نازیبا کلمات کہے اور فحش الزامات عائد کئے جن کی بعض ٹی وی چینلز اور ویب سائٹس نے خوب تشہیر کی۔ اس کے نتیجے میں کویت میں سیاسی کشیدگی پیدا ہوگئی جہاں تقریباً ۴۰ فیصد شیعہ آبادی ہے۔ چنانچہ کابینہ نے الحبیب کی شہریت ختم کردی لیکن اس اقدام سے اضطراب ختم نہیں ہوا۔

امام سید علی خامنائی نے اپنے مختصر مگر دوٹوک جواب میں فرمایا: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ہمارے سنی بھائیوں کی علامتوں اور مقدسات کی توہین وتحقیر، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ازواج پر تہمت باندھنا، جو ان کے شرف میں خلل پڑنے کا باعث ہو حرام ہے۔ بلکہ یہ امر تمام انبیاء کی ازواج اور خاص طور سے ان کے سردار وسرور رسول اللہ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجات کے لئے محال ہے''۔شیعہ نیٹ پر ایک وضاحت میں کہا گیا ہے کہ جو تہمتیں حضرت عائشہ زوجہ رسولؐ پر لگائی گئی ہیں، شیعہ اعتقادات کے مطابق دیگر انبیاء کی ازواج حتیٰ کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کے ازواج پر بھی نہیں لگائی جاسکتیں اور انبیاء علیہ السلام کے حریم ان تہمتوں سے مکمل طور پر پاک ہیں۔اہل بیت نیوز ایجنسی کے مطابق حوزۂ علمیہ قم کے علماء واساتذہ نے رہبر انقلاب کے اس فتوے کی پرزور تائید کی ہے اور ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ 'شیعہ اعتقادات زوجۂ پیغمبر اکرمؐ کو فحشاء سے نسبت کو غلط اور خلاف حقیقت سمجھتے ہیں اور شیعہ علماء نے سورۂ نور میں 'افک' کے قصے کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی زوجات کو فحشاء کے بہتان سے مکمل طور پر بری قرار دیا ہے'۔

لبنان کی شیعہ تنظیم 'جماعت علمائے مسلمین' کے ترجمان شیخ عمرو نے کہا ہے کہ جو اختلافات ابھارے جارہے ہیں ان کا شیعہ اعتقادات اور دینی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں۔(وہ سیاسی اختلافات تھے)انہوں نے کہا کہ انقلاب اسلامی رہبر کا فتویٰ ایک فقہی اور سیاسی فتویٰ ہے اور اس اعتبار سے تمام اہل تشیع، خواہ وہ امام خامنائی کے مقلد نہ ہوں، اس پر عمل کے پابند ہوجاتے ہیں'۔

لبنان کے سنی علماء بورڈ کے سربراہ شیک ماہر مزبر نے کہا ہے کہ آیت اللہ العظمیٰ کا فتویٰ امت اسلامی کے قائد اور پیشوا کی حیثیت سے آپ کی حکمت، علم ودانش اور اعلیٰ درجہ کے ایمان کی علامت ہے کیونکہ اسلامی امہ کا اصل امام وہ ہے جو امت کے درمیان اتحاد اور یکجہتی قائم کرے۔

جامعہ الازہر کے چانسلر ڈاکٹر احمد الطیب نے ایک تحریری بیان جاری کر کے اس فتوے کو

مبارک قرار دیا اور کہا ہے، 'جو چیز اس فتوے کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مسلمانان عالم کے بزرگ علماء میں سے ایک عالم دین، عالم تشیع کے بزرگ مراجع میں سے ایک ممتاز ترین مرجع اور اسلامی جمہوریہ ایران کے اعلیٰ ترین رہبر نے صادر کیا ہے'۔ انہوں نے کہا، 'علم کے مقام سے اور شرعی ذمے داری جو میرے دوش پر ہے، کی بناء پر کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی کوشش واجب ہے اور جو شخص مسلمانوں میں اختلاف اور تفرقہ ڈالے وہ گنہگار اور عذاب الٰہی کا مستحق ہے، عوام اس سے کنارہ کریں'۔ سب سے اہم یہ کہ کویت حکومت نے اس فتوے کا خیر مقدم کیا ہے۔ وزیر اعظم شیخ ناصر محمد الاحمد الجابر الصباح کی صدارت میں منعقدہ کابینہ کی میٹنگ میں امام خامنائی کے اس اقدام کو بنظر استحسان دیکھا گیا اور اس پر اظہار تشکر و اطمینان کیا گیا۔ یروشلم کی رپورٹ مظہر ہے کہ بیت المقدس کے امام شیخ مہر حمود نے اس فتوے کو مسلم اتحاد کے لئے نیک فال قرار دیا ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے پروفیسر مدحت حماد نے اس کو 'فکر میں سنجیدہ تبدیلی' سے تعبیر کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ امام خامنائی کی شخصیت کیوں کہ بہت ہی بلند اور محترم ہے، اس لئے اس کا اثر دور تک محسوس کیا جائے گا'۔

ہندوستان میں بھی اس فتوے کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر اور معروف عالم دین مولانا سید جمال الدین عمری نے کہا ہے: ''یہ فتویٰ نہایت قابل ستائش ہے۔ اس کا خیر مقدم ہونا چاہئے۔ اس سے امید ہے کہ سنی شیعہ اختلافات کم ہوں گے اور ملی اتحاد کی راہیں کھلیں گی۔ اس فتوے کو عام کرنے کی ضرورت ہے''۔ جمعیۃ علماء ہند کے سیکریٹری مولانا عبدالحمید نعمانی نے، جو دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض بھی انجام دیتے ہیں، اس کو بڑی اچھی علامت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ'' اس میں مسلمانوں کے دونوں بڑے مکاتب فکر کے لئے رہنمائی اور روشنی ہے۔ انہوں نے کہا اس پر توجہ دی جانی چاہئے اور اس پر عمل ہونا چاہئے۔ توقع ہے کہ یہ بات بہت موثر ثابت ہوگی'۔ معروف صحافی محمد احمد کاظمی نے کہا ہے کہ یہ فتویٰ کسی مخصوص خطے کے لئے نہیں ہے اور توقع ظاہر کی کہ برصغیر میں بھی اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوگا''۔ (بشکریہ 'دعوت' دہلی)

ہم 'ملی مجلس شرعی' کے سیکریٹری کی حیثیت سے اس فتوے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمیں

توقع ہے کہ پاکستان کے شیعہ اور سنی علماء اس فتوے کا خیر مقدم کریں گے اور اگر اس پر کماحقہ عمل ہوتا ہے تو یہ فتویٰ دونوں مکاتب فکر کے درمیان فاصلوں کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمود احمد غازی —— کچھ یادیں، کچھ باتیں

ڈاکٹر محمود احمد غازی بھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اور اتنے اچانک کہ ابھی تک یقین نہیں آتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ غالباً 1993ء کی بات ہے جب ہم مرحوم ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب کے ساتھ ایک نیم سرکاری تعلیمی فاؤنڈیشن میں ڈائریکٹر نصابیات کے طور پر کام کرتے تھے۔ہم نے اڑھائی تین سال کی محنت سے پہلی سے بارہویں تک کے نصاب کو از سرنو اسلامی تناظر میں مدون کیا۔ اب اس نصاب کے مطابق نصابی کتب مدون کرنے کا مرحلہ درپیش تھا لیکن ٹرسٹیوں اور ملک صاحب میں اختلافات کے پیش نظر کام ٹھپ ہوکر رہ گیا۔ ہم نے چند ماہ انتظار کیا لیکن جب دیکھا کہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا تو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے 'ادارہ تحقیقات اسلامی' کے سربراہ اور اپنے مہربان ڈاکٹر ظفر اسحق انصاری صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ کسی دوسری مصروفیت کا متلاشی ہوں۔ چند دن بعد ان کا فون آ گیا کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب سے آ کر ملو۔ وہ ان دنوں ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈیمی تھے، میں جا کر ان سے ملا۔ سانولا رنگ، لمبا قد اور لباس میں قدیم و جدید کا امتزاج یعنی سوٹ کے ساتھ نکٹائی لیکن سر پہ جناح کیپ اور چھوٹی داڑھی۔ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کی زیادہ تر دلچسپی اسلامیات کے کن شعبوں سے ہے؟ میں نے کہا 'مزاجاً دعوت سے لیکن تعلیمی اسناد کے لحاظ سے اسلامی قانون سے'۔ کہنے لگے خیر، ان شاء اللہ دونوں اپنے بس میں ہیں (وہ ان دنوں شریعہ اکیڈیمی کے انچارج بھی تھے)۔ چنانچہ انہوں نے میری تعیناتی شریعہ اکیڈیمی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کرادی۔ وہاں سول اور ایڈیشنل

ڈسٹرکٹ ججوں کی اسلامی قانون میں تربیت کے علاوہ شریعہ میں تالیف وتدوین کا شعبہ بھی میرے سپرد تھا۔ وہ ان شعبوں میں میری تجاویز اور رپورٹوں پر عموماً من وعن صاد کردیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے نوٹ لکھا کہ مجھے ان کاموں کا کوئی تجربہ نہیں اور یہاں کوئی ایسے ساتھی بھی نہیں جن سے مشاورت کی جاسکے اور یہ بڑے بڑے علمی منصوبے ہیں اور آپ بلا بحث وادنی تغیر ان پر صاد کردیتے ہیں۔ جواب میں 'من تواضع للہ رفعہ' کا مختصر جواب لکھ کر یہ باب بند کردیا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرتے تھے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی علمی ترقی پر خوش ہوتے تھے۔

ان دنوں میری فیملی لاہور میں تھی لہٰذا میرے پاس کافی وقت بچ جاتا اور میں نے نوائے وقت میں ہفتہ وار کالم 'فکر ونظر' لکھنا شروع کردیا۔ ایک دفعہ میں مساجد میں اسلامی تعلیم کے موضوع پر کالم لکھنا چاہتا تھا تو میں نے بعض معلومات کے لئے ایک جاننے والے صاحب کو وفاقی وزارت تعلیم میں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب نے ایک سروے کرایا تھا جس سے پتہ چلا کہ ہماری مساجد میں سے صرف 25 فیصد ایسی ہیں جہاں باقاعدہ سند یافتہ امام ہیں جو عوام کو قرآن وحدیث کا درس دے سکتے ہیں۔ یہ اعداد وشمار چونکا دینے والے تھے۔ اتفاق سے اسی شام کسی وجہ سے مجھے ڈاکٹر غازی صاحب کے گھر جانا پڑا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے اپنے کالم کے سلسلے میں یہ اعداد وشمار ملے ہیں۔ کہنے لگے اس بات کو ہرگز اپنے کالم میں نہ لکھنا کیونکہ اس سے علماء کی ہوا خیزی ہوگی اور علماء چونکہ ہمارے معاشرے میں دین کے نمائندے ہیں لہٰذا اس سے دین کی بھی ہوا خیزی ہوگی۔

اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سالہ قیام کے دوران ہی مجھے یہ آئیڈیا سوجھا کہ اسلامی مشاورتی کونسل چونکہ غیر فعال ہے لہٰذا کیوں نہ پرائیویٹ سطح پر مختلف مسالک کے علماء کرام اور اسلامی سکالرز پر مشتمل ایک علمی مجلس ایسی بنائی جائے جو معاشرے کو درپیش مسائل میں اسلامی حوالے سے غور کرکے اپنی سفارشات عوام اور حکومت کے سامنے لائے تاکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے استفادہ کرلیں۔ میں یونیورسٹی میں نیا اور ناتجربہ کار تھا اور غازی صاحب کا

جونیئر تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس معاملے میں میری بھرپور حوصلہ افزائی کی اور اس منصوبے کو آگے بڑھانے میں میرے ساتھ مل کر کام کیا۔ مجوزہ ادارے کی تشکیل کے لئے بلائے گئے ہر اجلاس میں پرجوش طریقے سے شریک ہوتے بلکہ بہاول پور یونیورسٹی سے آئے ہوئے اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر یوسف فاروقی صاحب کو بھی اپنے ساتھ لاتے۔(اس معاملے میں معروف اہل حدیث عالم مولانا عبدالغفار حسن مرحوم نے بھی ہمارا بھرپور ساتھ دیا) لیکن بُرا ہو 'معاصرت' کا کہ یونیورسٹی کی ایک سینئر اسلامی شخصیت نے اس کام میں اس طرح مداخلت کی کہ اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اللہ ان کو بھی معاف فرمائے اور ہمیں بھی۔ (ہماری اس دیرینہ خواہش کی مظہر 'مجلس فکر ونظر' تھی جو ہم نے جامعہ پنجاب کے دوران قیام تشکیل دی اور اب 'ملی مجلس شرعی' ہے جو سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کا متحدہ پلیٹ فارم ہے)۔

غازی صاحب مرحوم کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دینی فکر وعمل میں معتدل مزاج تھے۔ نہ تجمد کے قائل تھے اور نہ تجدد کے۔ یوں ہمارے معاشرے میں جو اصحاب وطبقات تجمد کی طرف میلان رکھتے ہیں وہ ان کے ناقد تھے اور جو اصحاب تجدد کی طرف میلان رکھتے ہیں وہ بھی انہیں ناپسند کرتے تھے لیکن ہمارے نزدیک ان کا معتدل رویہ قابل تعریف تھا بلکہ وہ جدید وقدیم کے امتزاج کا بہترین نمونہ تھے۔کراچی یونیورسٹی میں ہمارے دوست خالد جامعی صاحب جو جدیدیت کے خلاف تیغ برّاں ہیں وہ غازی صاحب کا شمار بھی تجدد زدہ لوگوں میں کرتے ہیں۔ جب انہوں نے اس کا اظہار اپنے جریدے 'ساحل' میں کیااور غازی صاحب کے خلاف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیاتو ہم نے دوستانہ اختلاف کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایسانہ کریں کیونکہ ہماری رائے میں غازی صاحب اس عتاب کے مستحق نہ تھے چنانچہ انہوں نے وقتی طور پر ہماری درخواست قبول فرمالی (گوجامعی صاحب اپنے نظریات میں بہت پختہ ہیں اوراپنی رائے پر اب بھی قائم ہیں)۔

ہمارے نزدیک فکری رویوں کے بڑے بڑے دائرے ہیں اور ہر دائرے کا ایک سنٹر ہوتا ہے اور جو لوگ اس سنٹر سے تھوڑا دائیں یا بائیں ہوتے ہیں ان کا شمار بھی اسی دائرے

میں ہونا چاہیئے خواہ وہ اس دائرے کی مین اسٹریم سے تھوڑے دور اور مختلف ہی کیوں نہ ہوں مثلاً متجد دین کے دائرے میں برصغیر کی دینی روایت کے لحاظ سے سرسید، چکڑالوی، امرتسری، غلام احمد پرویز، جاوید احمد غامدی صاحب۔۔۔وغیرہ ہیں لیکن اقبال، مولانا مودودیؒ اورڈاکٹر غازی صاحب کو اس دائرے میں شامل کرنا، ہمارے نزدیک، زیادتی ہے۔ ہماری غازی صاحب سے اس موضوع پر کئی دفعہ بات ہوئی لیکن انہوں نے کبھی اس طبقہ متجددین کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہا لیکن مغرب کے حوالے سے جو ان کی اپروچ تھی، ضروری نہیں ہے اس سے خالد جامعی صاحب جیسے اصحاب بھی مطمئن ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں مغرب زدہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح بلاشبہ وہ حلقہ دیوبند کے قریب تھے (بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے خاندان میں سے تھے) لیکن ہمارے علم اور مشاہدے کی حد تک وہ اس میں بھی معتدل مزاج تھے اور ہرگز متشدد نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بریلوی بھائیوں کو ان کا یہ اعتدال نہ بھاتا ہواور وہ انہیں حکومت میں ایک دیوبندی وزیر سمجھ کر ان کی مخالفت کرتے ہوں۔

وزارت سے یاد آیا کہ بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں وزیر مذہبی امور کی ذمہ داری کیوں قبول کی؟ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا ہم لاہور میں تھے۔ ایک دفعہ کسی مظلوم کی مدد کے سلسلے میں ان کے ہاں حاضر ہوا تو انہوں نے بھرپور معاونت کی لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ حکومت میں خاصے غیر مطمئن تھے اور اپنے آپ کو misfit محسوس کرتے تھے اور اسے چھوڑنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اب انہیں کمبل نہیں چھوڑتا تھا۔ناچار انہوں نے پبلک بیان دے دیا کہ وہ فلاں مہینے وزارت چھوڑ دیں گے اور پھر چھوڑ بھی دی۔ یار لوگ کہیں گے کہ قبول ہی کیوں کی تھی؟ ہم سمجھتے ہیں کہ غازی صاحب اپنی اہلیت کے بل پر بڑے سے بڑے منصب کے اہل تھے لیکن ہمارے معاشرے کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو داڑھی رکھتا، ٹوپی پہنتااورعربی اسلامیات میں مہارت رکھتا ہو، اسے مولوی سمجھتا اور بطور مولوی ٹریٹ کرتا ہے(خواہ وہ

روایتی 'مولویت' سے دور ہی کیوں نہ ہو) اس طرح باصلاحیت لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے اظہار و استعمال کے موزوں مواقع میسر نہیں آتے اور ان میں ردعمل کی ایک نفسیات پیدا ہوجاتی ہے اور پھر جب انہیں کوئی موقع ملے تو وہ اسے قبول کر لیتے ہیں خواہ اس کی 'موزونیت' کچھ مشکوک ہی کیوں نہ ہو۔ ویسے بھی معتدل مزاج ہونے کی وجہ سے غازی صاحب اپنی افتادِ طبع میں اینٹی اسٹیبلشمنٹ آدمی نہ تھے۔ پھر ملت کا درد رکھنے اور معاشرے کے دینی مستقبل کے حوالے سے سوچنے والے شخص کی حیثیت سے ان کے ذہن میں کئی منصوبے تھے، ان کا خیال ہوگا کہ وہ اقتدار میں آ کر ان منصوبوں میں سے بعض پر عمل کر سکیں گے لیکن غالباً حکومت میں جانے کے بعد جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ہمارا سیاسی نظام اور بیوروکریسی کا نظام نمک کی وہ کان ہے جس میں جانے والا خود نمک ہوجاتا ہے اور اس کا اپنا میٹھا پانی بھی کھاری ہونے لگتا ہے چہ جائیکہ وہ وہاں کے پانی کو میٹھا کرنے کے کسی منصوبے پر عمل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وزارت میں زیادہ دیر نہ ٹک سکے اور باہر آ گئے۔ غازی صاحب کے وزارت قبول کرنے کے حوالے سے ہم نے جو کچھ ابھی کہا وہ ہمارا ذاتی تجزیہ ہے جس سے اختلاف کا حق ہر صاحب فکر ونظر کو ہے۔

پھر ہم نے اخبارات میں پڑھا کہ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے صدر ہوگئے ہیں۔ یہ ان کی محبت اور بڑا پن تھا کہ انہوں نے خود فون کر کے مجھے کہا کہ میرے پاس اسلام آباد آجاؤ یہاں کام کے بڑے مواقع ہیں اور ترقی کے بھی۔ ایک یونیورسٹی کے زیرک سربراہ کی حیثیت سے انہیں خوب اندازہ تھا کہ یونیورسٹی بڑی بڑی بلڈنگوں کا نام نہیں ہوتی بلکہ جتنے بڑے اہل علم اس سے وابستہ ہوں یہ اتنی ہی بڑی ہوتی ہے اور جب اس میں کام کرنے والے بونے ہوں تو یونیورسٹی کی عظیم الشان بلڈنگیں اسے عظمت نہیں بخش سکتیں۔ چنانچہ جب وہ یونیورسٹی کے صدر نہ رہے اور ان کا واسطہ بونوں سے پڑا تو وہ خاموشی سے یونیورسٹی چھوڑ گئے اور جامعہ قطر چلے گئے کیونکہ وہ لڑنے والے آدمی تھے ہی نہیں۔

ہاں! تو ہم عرض کر رہے تھے کہ غازی صاحب نے ہمیں اسلام آباد یونیورسٹی آنے کی

دعوت دی لیکن ہم وہ راجپوت ہیں جن کا راج نہیں رہا لیکن بھوت باقی رہ گیا ہے چنانچہ ہم نے تحریک اصلاح تعلیم اور نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کے محاذ سے نہ ہٹنے کی ضد میں ان سے معذرت کرلی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم کوئی قلعہ فتح نہیں کرسکے لیکن ہمارے نزدیک وفاداری بشرط استواری ہی اصل ایماں ہے۔ چنانچہ ہم اپنی ہٹ پہ قائم ہیں کہ غازی نہ بن سکے، شہید تو ہوں گے، اور شہید بھی نہ ہوئے تو شہادت کی تمنا تو ہے، ہم معرکۂ کارزار میں تو ہیں، ہاتھ پاؤں تو چلا رہے ہیں —— اور ممکن ہے ہمارے رب کو ہماری یہی ادا پسند آجائے۔

جب ہم نے پنجاب یونیورسٹی جوائن کی تو سرکاری ضرورت کے تحت ایک سال ہم نے جو غازی صاحب کے ساتھ اسلامی یونیورسٹی میں کام کیا تھا اس کا تجربے کا سرٹیفکیٹ بھجوانے کی ان سے درخواست کی۔ انہوں نے سرکاری خط بھجوانے کے ساتھ جو ذاتی خط مجھے لکھا وہ

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں، یہ ایک مشن ہے، ایک جذبہ ہے اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی اور اتفاق ہے تو کوشش کیجئے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔

خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

فی شمارہ 35 روپے سالانہ 400 روپے

تاحیات معاون 5,000 روپے، معاون خصوصی 10,000 روپے

چیک بنام ارقم فاؤنڈیشن اور منی آرڈر بنام ناظم دفتر 135-A ہنزہ بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے یا دفتر ہنزہ بلاک میں دستی جمع کروا کر رسید حاصل کیجئے۔

پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں مرجاؤں تو یہ خط

میری قبر میں رکھ دینا کہ یہ ایک مسلمان کی دوسرے کے بارے میں بے ریا شہادت ہے، شائد اللہ اسے قبول فرمالے۔ **اللھم اغفرلہ وادخلہ مدخلاً کریما وارزقہ جنۃ الفردوس۔**

تحریک اصلاح تعلیم شروع دن سے اس مؤقف کی حامی رہی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا جب تک علی گڑھ اور دیوبند کی جگہ ایک تیسرا رول ماڈل تعلیمی ادارہ (سکول و مدرسہ تا یونیورسٹی) قائم کر کے نہ دکھا دیا جائے جو سابقہ رول ماڈلز کی خامیوں سے پاک ہو، ان کی خوبیوں کا جامع ہو اور اسلامی ہونے کے ساتھ عصری ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہو۔

اس ضمن میں ہم نے پچھلے چند سالوں میں اپنی صلاحیت کے مطابق غور وفکر کر کے ''ایک نئے رول ماڈل تعلیمی نظام کا خاکہ''، ''ایک رول ماڈل اسلامی سکول کا خاکہ''، ''رول ماڈل دینی تعلیم کا خاکہ'' اور ''ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ'' کے عناوین کے تحت اپنے خیالات کو منضبط کیا ہے اور یہ مضامین ہماری کتاب ''ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'' میں موجود ہیں جو محدود تعداد میں تعلیمی حلقوں تک پہنچی ہے۔ البرہان کے اجراء کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اپنے قارئین تک اپنے افکار پہنچائیں چنانچہ پچھلے شمارے میں ''ایک رول ماڈل اسلامی سکول کا خاکہ'' اور ''رول ماڈل دینی تعلیم'' پر مضامین شائع ہو چکے ہیں اور اس دفعہ ''ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ'' آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ یونیورسٹی کی پوری اسکیم کا محض ابتدائیہ ہے جس میں اس مجوزہ یونیورسٹی کی نوعیت اور اس کے اہم خصائص کا تذکرہ آ گیا ہے۔ ہم اہل علم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس خاکے پر تنقید کر کے اسے بہتر بنانے میں ہماری مدد کریں۔

ڈاکٹر محمد امین

ایک رول ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ

نوعیت

یہ ایک نان کمرشل اور فلاحی اسلامی یونیورسٹی ہوگی۔ تعلیم کے اسلامی تصور کی رو سے تعلیم کے تین شعبے ہوتے ہیں:

۱۔ تدریس
۲۔ تحقیق؛ اور
۳۔ تربیت

تدریس وتعلیم میں صرف دینی تعلیم ہی شامل نہیں بلکہ وہ سارے معاصر علوم اور مہارتیں بھی شامل ہیں جن کی مسلم معاشرے کو ضرورت ہو لہٰذا اس مجوزہ یونیورسٹی میں اگرچہ دینی تعلیم بنیادی اہمیت کی حامل ہوگی تاہم اس میں عمرانی علوم پر بھی ترکیز ہوگی اور بعض سائنس علوم بھی پڑھائے جائیں گے، اس فرق کے ساتھ کہ دینی تعلیم جدید تناظر میں اس طرح دی جائے گی کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کر سکے اور عصری علوم اسلامی تناظر میں پڑھائے جائیں گے۔ نیز یہاں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا انتظام ہوگا اور طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار پر بھرپور توجہ دی جائے گی جو تعلیم کی اصل غایت ہے۔ اس کے نان کمرشل اور فلاحی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

اس یونیورسٹی کے محرکین کے پیش نظر دولت کمانا نہیں بلکہ رضائے الٰہی کی خاطر دین، معاشرے اور ملت کی خدمت کرنا ہے لہٰذا طلبہ سے فیسیں اتنی ہی وصول کی جائیں گی جن سے یونیورسٹی کے اخراجات پورے ہوسکیں۔

ضرورت

۱۔ پاکستان میں پچھلے چند برسوں میں کئی ایک پرائیویٹ یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں لیکن عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ یونیورسٹیاں صرف وہ مضامین پڑھاتی ہیں جن میں آمدنی زیادہ سے زیادہ ہو مثلاً کمپیوٹر سائنس اور بزنس مینجمنٹ وغیرہ لیکن دوسرے بہت سے شعبوں کی تعلیم جو ہمارے معاشرے کے لئے مفید اور ضروری ہے مثلاً دینی تعلیم، عمرانی علوم کی تعلیم اور خود سائنسی مضامین کی تعلیم، یہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتیں۔ اس لئے ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس کمرشل ازم سے ہٹ کر صرف فلاحی بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لئے نہ صرف دینی علوم کی تعلیم دے بلکہ عمرانی اور سائنسی علوم کی تدریس کا بھی انتظام کرے۔

۲۔ پاکستان میں دینی تعلیم اس وقت زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں دینی مدارس کی صورت میں دی جارہی ہے لیکن بدقسمتی سے دینی مدارس کے بارے میں دنیا میں یہ عمومی تاثر قائم ہوگیا ہے کہ یہ مدارس جہاد اور قدامت پرستی اور دہشت گردی کے گڑھ ہیں۔

دنیا کے یہ تاثر قائم کرنے کے تین بڑے سبب ہیں:

- دینی مدارس کا اپنے ہاں جدید علوم نہ پڑھانا
- مستقبل میں بھی جدید علوم پڑھانے سے انکار کرنا
- دینی مدارس کے فارغ التحصیل بعض افغانی طلبہ کا جہاد افغانستان میں شریک ہونا، وہاں حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوجانا اور وہ حکومت اس طرح چلانا کہ وہ جدید دنیا کے لئے قابل قبول نہ ہو۔

ان وجوہ سے نہ صرف دینی مدارس کے بارے میں دنیا میں خراب تاثر ابھرا بلکہ خود اسلام

کے بارے میں یہ تاثر عام ہوا کہ یہ تنگ نظری اور دہشت گردی کا دین ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو اعتدال، رواداری اور روشن خیالی کا دین ہے اور وہ علم، امن، اخوت اور جدت کا علم بردار ہے۔لہٰذا دینی مدارس اور دینی تعلیم کے حوالے سے قائم ہوجانے والے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر میں دینی تعلیم کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید عصری علوم کی تعلیم بھی دی جائے اور دینی تعلیم بھی اس طرح دی جائے کہ وہ جدید اذہان کے لئے قابل استفادہ ہو۔

۳۔ پاکستان میں اس وقت دینی علوم کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جو اسلام آباد میں ہے لیکن یہ یونیورسٹی بین الاقوامی نوعیت کی ہے اور اس کے طلبہ و اساتذہ کی ایک کثیر تعداد دیگر مسلم ممالک سے آتی ہے لہٰذا ایک خالص پاکستانی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔

۴۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کی ۸۷ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ یہ مسلمان، روایتی طور پر پُرجوش مسلمان ہیں اور نہ صرف خود اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے ہیں بلکہ یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی اچھی مسلمان ہو اور اسلامی اصولوں سے وابستہ ہو اور ساتھ ہی دنیا میں بھی ترقی کرے۔ بدقسمتی سے دینی مدارس اس کے لئے موزوں ماحول فراہم نہیں کرتے اس لئے اکثر کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے لوگ اپنے بچوں کو دینی مدارس میں نہیں بھجواتے اس کے باوجود کہ وہ اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں۔ اس طرح پاکستانی معاشرے میں ایک تعلیمی اور تہذیبی خلاء موجود ہے جسے پُر کیا جانا ضروری ہے۔

۵۔ ہمارے ملک میں ایک بھی دینی ادارہ ایسا نہیں ہے جو ایسے علماء و سکالرز پیدا کر رہا ہو جو غیر مسلم دنیا بالخصوص مغرب کو اس کی زبان میں اور اس کے ماحول کے تناظر میں اسلام پیش کر سکیں اور اسلام کی حقانیت ان پر واضح کر سکیں۔ اس کے برعکس جو روایتی علماء وہاں جاتے ہیں وہ وہاں جا کر اپنے اپنے مسلک کا پرچار کرتے ہیں اور پاکستانی اسٹائل کے دینی مدارس وہاں قائم کرنا دین کی بہترین خدمت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے

کہ پاکستان میں دینی تعلیم کا کم از کم ایک مرکز تو ایسا ہونا چاہیئے جہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء و سکالرز یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ اہل مغرب کو دین اسلام ان کی زبان میں اور ان کے ماحول کے تناظر میں سمجھا سکیں تا کہ اسلام کی اعلیٰ و ارفع تعلیمات ان کے ذہن نشین ہوسکیں اور ان کے اذہان وقلوب کو مسخر کرسکیں۔

۶۔ پاکستان کو معتدل ذہن رکھنے والے ایسے روشن خیال علماء و سکالرز کی ضرورت ہے جو ایک طرف مسالک سے بالا تر رہتے ہوئے دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہوں تو دوسری طرف جدید علوم اور تقاضوں سے بھی بہت اچھی طرح باخبر ہوں تا کہ معتدل اور روشن خیال مذہبی رجحانات رکھنے والا معاشرہ وجود میں آسکے۔ معاشرے کی یہ ضرورت اس وقت کہیں سے پوری نہیں ہورہی اس لئے ایک ایسے علمی اور تعلیمی مرکز کی ضرورت کا احساس ابھرتا ہے جو اس خلا کو پُر کر سکے۔

۷۔ اسلام اور نظریۂ پاکستان ہی مملکت خداداد پاکستان کے وجود میں آنے کا سبب ہے اور یہی اس کے بقاء و استحکام کا ضامن ہے اس لئے پاکستان کی بقاء سلامتی، استحکام اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے تا کہ اس کی جغرافیائی بنیادیں بھی مستحکم ہوں اور ہماری آئندہ نسلیں اسلامی اور ملی تفاخر کے ساتھ قوموں کی برادری میں آگے بڑھ سکیں۔

۸۔ پچھلے پچاس سال میں پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں نے سارے شعبہ ہائے زندگی خصوصاً تعلیم کو اسلامی تناظر میں ڈھالنے میں جس تساہل سے کام لیا ہے اور بین الاقوامی طور پر تعلیم کی سیکولرائزیشن اور گلوبلائزیشن کی اس وقت جو فضاء ہے اس میں حکومت پاکستان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی اسلامی یونیورسٹی قائم کرے گی۔ دوسری طرف برصغیر کے مسلمان پرائیویٹ سیکٹر میں اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی شاندار روایت رکھتے ہیں اور انہوں نے نہ صرف ماضی میں دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، جامعہ ملیہ، انجمن حمایت اسلام اور کئی دیگر

تعلیمی ادارے قائم کیے بلکہ پاکستان بننے کے بعد بھی لاہور (جامعہ اشرفیہ، جامعہ نعیمیہ وغیرہ)، کراچی (دارالعلوم ملیر و بنوری ٹاؤن)، ملتان بھیرہ، اکوڑہ خٹک وغیرہ میں بڑے دینی مدارس قائم کیے بلکہ آج بھی ملک بھر میں ہزاروں دینی مدارس کام کررہے ہیں جن پر کروڑوں روپے ماہانہ خرچ اٹھ رہا ہے۔ لہٰذا یہ توقع بے جا نہیں کہ پرائیویٹ سیکٹر کو متحرک کر کے ایک جدید اسلامی یونیورسٹی بنائی اور چلائی جاسکتی ہے۔

۹۔ پاکستان میں موجودہ تعلیمی ثنویت کا ایک بڑا سبب اور مظہر دیوبند اور علی گڑھ کا رول ماڈل تعلیمی اداروں کی شکل اختیار کر جانا ہے لہٰذا اب جو کوئی بھی مدرسہ کھولنا چاہتا ہے وہ بنیادی طور پر دیوبند کی طرز کا درس نظامی پر مبنی مدرسہ کھولتا ہے اور اگر کوئی جدید سکول، کالج اور یونیورسٹی کھولنا چاہتا ہے تو وہ علی گڑھ کے قائم کردہ منہاج کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کیونکہ دیوبند اور علی گڑھ کے علاوہ کوئی تیسرا تعلیمی رول ماڈل ہمارے سامنے موجود ہی نہیں (ندوہ اور جامعہ ملیہ نے تیسرا رول ماڈل بننے کی کوشش کی لیکن بوجوہ ناکام ہوگئے)۔ لہٰذا اب تعلیم کی بہتری کی یہی صورت ممکن ہے کہ ایک تیسرا رول ماڈل تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو دیوبند اور علی گڑھ کی خوبیوں کا جامع ہو، ان کی کمزوریوں سے پاک ہو اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہو تاکہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیمی ضروریات دونوں ایک ہی جگہ سے پوری ہوسکیں۔

۱۰۔ یہ یونیورسٹی ایسا ماحول پیدا کرے گی کہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر اسلامی تناظر میں علوم اور تعلیم وتربیت کی تشکیل نو ہوسکے اور ایسے افراد تیار ہوں سکیں جنہیں اپنے ماضی پر فخر ہو اور وہ اسلام کے غلبے اور مسلم سأۃ ثانیہ میں قائدانہ کردار ادا کرسکیں اور مسلم معاشرے کی جدید مسائل کے حل میں علمی وفکری رہنمائی کرسکیں۔

ان حالات میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر میں ایک نان کمرشل اسلامی فلاحی یونیورسٹی قائم کی جائے جو مذکورہ بالا خلا کو پُر کرے اور ایسے افراد تیار کرے جو پاکستانی معاشرے کو اعتدال اور ترقی کے راستے پر اس طرح ڈال سکیں کہ

وہ اپنے دین سے بھی وابستہ ہوں اور اپنے اعلیٰ علمی اور تہذیبی ورثے پر فخر بھی ان کا سرمایۂ حیات ہو۔

اہداف و مقاصد

سطور بالا سے واضح ہوگیا کہ اس وقت پاکستان میں پرائیویٹ سیکٹر اور خصوصاً لاہور میں ایک نان کمرشل جدید اسلامی اور فلاحی یونیورسٹی قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے جس کے اہداف و مقاصد یہ ہوں:

۱۔ ایسے علماء و سکالرز کی تیاری جو پاکستانی معاشرے اور خصوصاً اس کی نسل نو کو اسلام کی ایک متوازن تعبیر کے ساتھ وابستہ رکھ سکیں اور جو غیر مسلم افراد اور قوموں کے سامنے اسلام کی ایک مؤثر، جاندار اور دل آویز تصویر پیش کر سکیں۔

۲۔ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور ماہرین تیار کرنا جو ہر شعبۂ زندگی میں پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

۳۔ جو تحقیق اور سیرت و کردار کی اعلیٰ روایات قائم کر کے مسلم معاشرے کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے اور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

۴۔ دینی مدارس کے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے اقدامات کرنا۔

۵۔ جدید تعلیمی اداروں کے کردار کی، ملک و ملت کی اسلامی ضرورتوں کے تناظر میں، تشکیل نو میں مدد دینا۔

ترجیحات اور طریق کار

مجوزہ یونیورسٹی مذکورہ اہداف و مقاصد کے حصول کے لئے جو طریق کار اختیار کرے گی اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ دینی تعلیم اس طرح دے گی کہ جدید علوم سے آگاہی نصابِ تعلیم کا ایک حصہ ہوگی۔

۲۔ یونیورسٹی میں عمرانی اور سائنسی علوم ضروری دینی تعلیم کے ساتھ اور اسلامی تناظر میں اس طرح پڑھائے جائیں گے کہ طلبہ ان شعبوں میں اسلامی نقطۂ نظر اور مسلم پیش رفت دونوں سے بخوبی واقف ہوں۔

۳۔ مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے Double Major کا طریقہ اپنایا جائے گا، مطلب یہ کہ ہر طالب علم کا ایک بنیادی تخصص (Main Major) ہوگا اور ایک ثانوی تخصص (Sub Major)۔

دینی تعلیم کے متخصصین کے لئے جدید علوم کا تعارفی مطالعہ ثانوی تخصص ہوگا جس میں پاس ہونا ان کے لئے ضروری ہوگا۔ اسی طرح عمرانی اور سائنسی علوم کے طلبہ کے لئے دینی علوم کی تدریس ثانوی تخصص ہوگا جس میں پاس ہونا اس کے لئے لازمی ہوگا۔

۴۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ و تربیت پر بھرپور توجہ دی جائے گی اور طلبہ کی سیرت و کردار کے لئے خصوصی کوششیں کی جائیں گی تاکہ طلبہ کے پاس محض علم ہی نہ ہو بلکہ وہ اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک بھی ہوں۔

۵۔ ہمارے ملک میں عموماً یہ طریقہ مروج ہے کہ گریجوایشن تک عمومی مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور پھر اگلے دو سال میں کسی ایک خاص مضمون میں تخصص کروایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے طلبہ کی پیشہ ورانہ مہارت خام رہ جاتی ہے۔ بہتر طریقہ وہی ہے جو صدر اسلام میں مروج تھا اور ہمارے ہاں میڈیکل اور انجنیئر نگ میں اپنایا جاتا ہے کہ کسی علم یا فن میں مہارت کے لئے کم از کم پانچ چھ سال تک یکسوئی سے محنت کی جائے۔ چنانچہ مجوزہ یونیورسٹی میں ہر تخصص چھ سال کا ہوگا یعنی طالب علم جس مضمون میں ایم اے کرنا چاہے گا وہ اسے میٹرک کے بعد سے مسلسل چھ سال تک پڑھایا جائے گا۔

۶۔ مجوزہ یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ علمی اور فکری مرکز بنانے کے لئے تحقیق پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ایک وسیع لائبریری قائم کی جائے گی اور دوسری تحقیقی سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور ایم فل

اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیے جائیں گے۔

۷۔ اگرچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت مسلمہ ہے اور مجوزہ یونیورسٹی میں بھی ان سے صرف نظر نہیں کیا جائے گا لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ دینی اور عمرانی علوم ہی دراصل وہ علوم ہیں جو انسان سازی کرتے ہیں اور معاشرے کو وہ بنیادی انسانی لوازمہ مہیا کرتے ہیں جو ہر قسم کی ترقی کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لئے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ مجوزہ یونیورسٹی کی ترجیحات میں عمرانی علوم کی تدریس سرفہرست ہوگی خصوصاً تربیت اساتذہ، ابلاغ عامہ، معاشیات اور قانون وغیرہ کی تدریس وتحقیق تاکہ معاشرے کی تعمیر وترقی کے لئے موزوں افرادکار کی کھیپ میسر آسکے۔ یاد رہے کہ پرائیویٹ سیکٹر میں بننے والی نئی یونیورسٹیوں میں عام طور پر عمرانی علوم سے صرف نظر کیا جاتا ہے کیونکہ ان شعبوں کی تدریس سے زیادہ آمدنی حاصل نہیں ہو پاتی۔ مجوزہ اسلامی یونیورسٹی کے پیش نظر چونکہ نفع اندوزی نہیں اس لئے یونیورسٹی ان شعبوں کو خصوصی اہمیت دے گی۔

۸۔ مجوزہ یونیورسٹی ایک نان کمرشل اور فلاحی ادارہ ہوگی جس میں طلبہ سے محض اتنی فیسیں وصول کی جائیں گی جن سے ادارے کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ گویا اس ادارے کو نہ نفع نہ نقصان (No-profit No-loss) کی بنیاد پر چلایا جائے گا۔

۹۔ مجوزہ یونیورسٹی ہر قسم کے دینی و سیاسی مسلک اور تحزب سے بالاتر رہتے ہوئے خالصتاً تعلیم، تربیت اور تحقیق کے شعبوں میں خدمات انجام دے گی۔

۱۰۔ مجوزہ یونیورسٹی میں حصول کمال یعنی کوالٹی اور ایکسی لینس کو بنیادی اہمیت دی جائے گی تاکہ قوم کے لئے بہترین افراد تیار کئے جاسکیں جو ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں خدمات انجام دے سکیں۔

۱۱۔ مجوزہ یونیورسٹی اگرچہ اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہوگی تاہم یہ یقینی بنانے کے لئے کہ اسے پہلے مرحلے پر ہی موزوں طلبہ میسر آسکیں وہ ایک ماڈل اسکول بھی قائم کرے گی اور یہ کوشش بھی

کرے گی کہ اس طرح کے بہت سے ماڈل اسکول قائم ہوجائیں تا کہ اسے بہترین طلبہ ابتداء ہی سے میسر آنے لگیں۔

۱۲۔ مجوزہ یونیورسٹی دینی مدارس کی اصلاح کے لئے ایک بھرپور پروگرام وضع کرے گی۔ وہ مدارس کے اساتذہ کو تربیت دے گی، ان کے فارغ التحصیل طلبہ کی ان مضامین میں تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے گی جو وہ مدارس میں نہیں پڑھ سکے۔ مجوزہ جامعہ دینی مدارس کو اصلاح نصاب میں مدد دے گی اور جو مدارس اس کے نصاب کو قبول کرلیں گے، ان کے امتحان لے کر ان کو منظور شدہ یونیورسٹی ڈگری دے گی۔ اسی طرح وہ مدارس کے طلبہ کو اسلامی علوم کے علاوہ مختلف سماجی علوم میں مناسب تیاری کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم دے گی۔ مقصود یہ ہے کہ مدارس کے طلبہ مرکزی معاشرتی دھارے(mainstream society) کے قریب آجائیں۔ اس سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوگی اور موجودہ تعلیمی ثنویت نے جس فکری وانتشار اور دیگر مسائل کو جنم دیا ہے، ان کی شدت بتدریج کم ہوتی چلی جائے۔

۱۳۔ مجوزہ جامعہ کے تعلیمی منہج کی تکمیل تین مراحل میں ہوگی: پہلے مرحلے میں اسلامی علوم اور بعض عمرانی علوم کی تدریس، دوسرے مرحلے میں اسلامی اور عمرانی علوم کی توسیع اور سکول سسٹم کا قیام اور تیسرے مرحلے میں سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم۔

۱۴۔ اسی طرح پہلے مرحلے میں طلبہ کی تربیت کا اہتمام کیا جائے گا اور دوسرے مرحلے میں مجوزہ پروگراموں میں طالبات کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۵۔ مجوزہ جامعہ اپنے Double Major کے تصور کے ساتھ اور اپنی دیگر خصوصیات کی بناء پر پاکستان بھر بلکہ ملت اسلامیہ کی ایک منفرد یونیورسٹی ہوگی جس کے اپنے منفرد نصابات ہوں گے اور انہی کے مطابق اساتذہ کی فراہمی وتربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ یونیورسٹی نظام تعلیم سے ثنویت کے خاتمے کے سلسلے میں ایک نئے رجحان کی نمائندہ ہوگی۔

۱۶۔ مجوزہ یونیورسٹی نہ صرف نسل نو کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے گی بلکہ یہ ان لوگوں کی بھی

خدمت کرے گی جو رسمی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہوں۔ جامعہ ایسے لوگوں کے لئے مقامی مراکز اور فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے ان کے علم میں اضافے اوران کی تربیت کی سعی کرے گی۔

۱۷۔ مجوزہ جامعہ اسلامی اورعمرانی علوم کے ساتھ سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی میں نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرے گی بلکہ اس کی یہ سعی بھی ہوگی کہ اس کا ہر گریجوایٹ خواہ وہ اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کررہا ہو یا عصری علوم کی، جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی سے استفادہ کرسکے تا کہ وہ جدید ماحول میں عصری تقاضوں کو پورا کرسکے، عصری چیلنجز سے عہدہ برآمد ہونے کے قابل ہو اور معاشرے کی رہنمائی کرسکے۔

۱۸۔ یہ یونیورسٹی چونکہ فقہی مسالک سے بالاتر ہوکر کام کرے گی اس لئے معاشرے میں یک جہتی اور دینی اخوت میں اضافے کا سبب بنے گی اورفرقہ واریت ومسلک پرستی کے رجحانات کی حوصلہ شکنی کا سبب بنے گی۔

۱۹۔ یہ یونیورسٹی اتحاد امت کا مظہراوراس کی نقیب ہوگی۔

۲۰۔ یہ جامعہ ان شعبوں میں تخلیقی تحقیق کا اہتمام کرے گی جن پر مسلم معاشرے میں بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن وہ انتہائی ضروری ہیں مثلاً ''مرکز تحقیق برائے مسلم سائنس ثانیہ'' ، ''مرکز مطالعۂ مغرب''، ''عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو کا تحقیقی ادارہ''۔۔۔وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد امین

میڈیا— رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق

قرآن وسنت کی روشنی میں

ابلاغ کا فن ہمیشہ سے انسانی معاشرے میں اہمیت کا حامل اور اس کا مؤثر استعمال قوت کا سبب اور مظہر رہا ہے چنانچہ قرآن حکیم (جو ہمارے پاس علم کا مستند ترین ماخذ ہے) ہمیں قدیم ترین پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابلاغی حکمت تفصیل سے بتاتا ہے (انبیاء کرام کی ابلاغی حکمت عملی ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم ان شاء اللہ جلد قلم اٹھائیں گے) اور قرآن وسنت سے ہمیں ابلاغ کی حکمت عملی اور طریق کار کے حوالے سے وسیع رہنمائی ملتی ہے۔

صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک مجتہدین، فقہاء، حکام، قضاۃ اور مسلم مفکرین کا یہ مستقل طریق کار اور اسلوب رہا ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے کہ اس کے بارے میں قرآن حکیم کا حکم کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی تعلیمات سے اس میں کیا رہنمائی ملتی ہے، اس کے بعد ہی وہ مذکورہ معاملے میں کوئی رائے قائم کرتے۔ چنانچہ آج جب ہمارے سامنے یہ سوال آئے کہ ہمارے ہاں میڈیا کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق کیا ہونا چاہئے تو منطقی طور پر ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بارے میں ہمیں قرآن وسنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ مغرب میں سائنسی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ فن ابلاغ نے جو محیر العقول ترقی کی ہے (دو تین سو سال پہلے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے، پھر ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، پھر الیکٹرانک میڈیا میں ٹی وی اور آج کل انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ) اس نے ابلاغ کو آج ایک مستقل سائنس اور فن بنا دیا ہے جو اپنی موجودہ ہیئت اور تفصیل میں اگرچہ نیا ہے لیکن جہاں تک ابلاغ، اس کی حکمت عملی اور اس کے ذرائع (مثلاً زبان، آنکھ، اور کان کے استعمال) کا تعلق ہے، ان میں سے کچھ بھی نیا نہیں اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ان سے بھرپور کام لیتے رہے ہیں چنانچہ آج ہم اگر اپنے ہاں میڈیا کی پالیسی اور رہنما اصول وضع کرنا چاہیں یا میڈیا کے لئے ضابطۂ اخلاق بنانا چاہیں تو

یقیناً ہمیں اس کے لئے قرآن وسنت سے واضح رہنمائی مل سکتی ہے اور قرآن وسنت کی نصوص سے بہت سے احکام مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

سہولت بیان کی خاطر ان ضوابط کو ہم ایجابی (Dos) یعنی وہ کام جو ذرائع ابلاغ کو کرنے چاہئیں اور سلبی (Donts) یعنی وہ کام جو اسے نہیں کرنے چاہئیں) میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اگر ہم ان دونوں کا احاطہ کرلیں تو قرآن وسنت کی روشنی میں میڈیا پالیسی کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق دونوں واضح صورت میں ہمارے سامنے آجائیں گے۔اور تفصیل کے لئے ہم ابتداء کرتے ہیں ایجابی پہلو سے یعنی وہ کام جو مسلم ذرائع کو کرنے چاہئیں:

۱۔ اشاعت دین/ دعوت وتبلیغ

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم کردی (الاحزاب ۳۳:۴۰) اور آئندہ کے لئے آپؐ کے پیروکاروں پر فرض کردیا کہ وہ دین اسلام دوسروں تک پہنچائیں (آل عمران ۳:۱۱۰) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی مفہوم میں فرمایا کہ مجھ سے لے کر یہ پیغام آگے پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء) اسی لئے مسلمان ایک مشنری امت ہیں اور دین کی اشاعت وتبلیغ اور غیر مسلموں بلکہ مسلمانوں تک (برائے تذکیر و تزکیہ) اس کی دعوت پہنچانا مسلمانوں کا اور ان کے ابلاغی اداروں کا ایک بنیادی فریضہ اور ہدف ہونا چاہئے۔اور جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ اسلام محض کوئی مذہب نہیں جو صرف اخلاقی، روحانی اور اخروی معاملات سے بحث کرتا ہو بلکہ یہ ایک دین، طرز زندگی اور نظام حیات ہے اور اس کا ہماری دنیاوی زندگی اور زندگی کے بارے میں ہمارے طرز عمل سے گہرا تعلق ہے لہٰذا اشاعت دین کا مطلب محض دینیاتی موضوعات پر وعظ ونصیحت نہیں بلکہ معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون۔۔۔غرض ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی حکمتیں واضح کرنا، ان کے اصول لوگوں کو بتانا اور انسانی وعقلی کاوشوں کے مقابلے میں قرآن وسنت کی ہدایت کے اعلیٰ، برتر اور قابل عمل ہونے کا اثبات کرنا بھی شامل ہے۔

۲۔ غیر اسلامی افکار واقدار کا رد

جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں اور یہی دعوت کی فطری ترتیب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا توحید (یعنی ایک الہ پر) ایمان لانا اس وقت تک نامکمل اور بے معنی ہے جب تک وہ ایک اللہ کے سوا دیگر معبودوں کا انکار نہ کرے۔ یہ بات اتنی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اس کے بغیر تمہارا ایمان لانا بے معنی ہے اور تمہارا کوئی اچھا عمل بھی قابل قبول نہیں ہے جب تک کہ تم شرک سے باز نہ آجاؤ (الانعام ۶:۸۸) یعنی ایک خدا کو ماننے کے ساتھ ساتھ دوسرے جھوٹے خداؤں کی خدائی کا انکار نہ کرو۔ ہماری رائے میں یہ بات بہت اہم ہے اسی لئے ہم نے اس کا الگ سے بیان ضروری سمجھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی حسین عنوان سے (خواہ اسے 'رواداری' کا نام دیا جائے یا 'ڈائیلاگ' کا یا 'تقابلی مطالعے' کا یا کچھ اور) کوئی مسلمان یا ان کا ابلاغی ادارہ یہ نہیں کرسکتا کہ وہ ایسے افکار مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور ان پر عمل کی انہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ ترغیب دے جو غیر اسلامی ہوں اور قرآن وسنت کی تعلیمات اور روح کے خلاف ہوں خواہ ان کا نام بظاہر کفر وشرک جیسا نہ ہو بلکہ سیکولرزم، لبرلزم، کیپٹل ازم، کمیونزم ۔۔۔ وغیرہ ہو۔ اس کی مثال نبی کریم ﷺ کا وہ اسوہ ہے کہ جس کی رو سے آپ ﷺ حضرت عمرؓ پر ان کے تورات پڑھنے پر ناراض ہوئے تھے حالانکہ اپنی دانست میں وہ اسے ایک سابقہ آسمانی صحیفہ سمجھ کر ہی پڑھ رہے تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ہماری اپروچ آج کے اس بین الاقوامی اصول کے خلاف ہے کہ ہر کسی کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہونی چاہئے۔ لامحدود شخصی آزادی اور لامحدود آزادئ اظہار مغرب کی ملحد تہذیب کے گمراہ کن اصول اور نعرے ہیں (اور خاص طور پر اہل مغرب ہر اس موقع پر اس کی آڑ لیتے ہیں جب انہیں اسلام کی مخالفت کرنا ہو اور مسلمانوں کے مقدسات [قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ] کی توہین کرنا ہو ورنہ آزادی کا فطری مفہوم

اور منطقی دائرہ کار یہ ہے کہ یہ ہمیشہ بعض شرط و قیود سے محدود ہوتی ہے جیسا کہ مشہور ضرب المثل ہے کہ 'جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے وہاں سے آپ کی آزادی ختم ہوجاتی ہے' اور اہل مغرب کا بھی یہ محض نعرہ ہی ہے ورنہ وہاں بھی آزادی بعض حدود سے مقید ہے۔ یقین نہ آئے تو مغرب میں جا کر جمہوریت کے خلاف مضمون لکھ کر اپنا حشر دیکھ لیجئے یا امریکہ میں جا کر امریکی آئین کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دیجئے تو ہم دیکھیں گے کہ کون آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ اہل مغرب کی آزاد خیالی کا تو یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کی مرضی کا لباس پہننے کی آزادی نہیں دے رہے (مسلمان عورت اپنی رائے کی آزادی کے تحت اپنا سر اور چہرہ نہیں ڈھانپ سکتی) اور مسلمانوں کو ان کی مرضی کی بلڈنگ بنانے کی اجازت نہیں دے رہے (وہ مسجد کا مینار نہیں بنا سکتے) تو پھر یہ آزادی کیسی آزادی ہے؟

پھر یہ کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام میں بے قید اور لامحدود آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اسلام کے تو لفظی اور اصطلاحی معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی اپنی آزاد مرضی سے اللہ کی غیر مشروط عبادت و اطاعت پر راضی ہوجائے اور اس کے بعد ہر معاملے میں اللہ کی مرضی اور رائے پر چلے اور اپنی مرضی اور رائے چھوڑ دے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مومن کی آزادی کی مثال اس گھوڑے سے دی جو ایک لمبی رسی سے بندھا ہو۔ (مسند احمد بن حنبل ۳:۸) یعنی وہ حرکت تو کرسکتا ہے لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک رسی اس کو جانے کی اجازت دے۔ لہٰذا ایک مسلمان آزاد ہے لیکن صرف اس حد تک جہاں وہ اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ بالفاظ دیگر وہ آزاد ہے لیکن جہاں سے اللہ کی حدود شروع ہوتی ہیں وہیں سے اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان صحافی اپنے ابلاغ میں کبھی مادر پدر آزاد نہیں ہوتا کہ وہ جو چاہے لکھے یا جو چاہے دکھائے اور سنائے بلکہ اسے اپنے لکھنے، دکھانے اور سنانے میں ان حدود و قیود کی پابندی کرنا ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مقرر کی ہیں۔ اسی ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ زبان کا غلط استعمال آدمی کو جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) لہٰذا مغرب کا لامحدود شخصی آزادی اور لامحدود آزدیٔ اظہار کا

تصور گمراہ کن ہے اور مسلمانوں کے لئے ناقابل عمل۔

۳۔ میڈیا کا تعلیمی کردار

میڈیا غیر رسمی تعلیم کا بہت بڑا ادارہ ہے بلکہ آج وہ اتنا مؤثر ہو چکا ہے کہ رسمی یا ریگولر تعلیم کو بھی پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اس کے اثرات پر بسا اوقات غالب آ جاتا ہے۔ تعلیم نام ہے علم کے ابلاغ اور معلومات بہم پہنچانے کا اور یہ وہ کام ہے جو آج میڈیا بخوبی سرانجام دے رہا ہے لیکن اسلام میں تعلیم کا مطلب محض ابلاغ نہیں بلکہ ابلاغ حق ہے یعنی تعلیم کا مطلب ہے 'صحیح' علم لوگوں تک پہنچانا، وہ علم جو 'حق' ہو یا 'حق' پر مبنی اور اس کے مطابق ہو یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی دفعہ سابقہ انبیاء اور خصوصاً آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا کہ ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ 'کتاب وحکمت' کی تعلیم دیں (البقرہ ۲:۱۲۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری ہے کہ مسلم میڈیا لوگوں تک قرآن پہنچائے اور انہیں قرآن کی تعلیم دے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جو بھی تعلیم دے اور معلومات بہم پہنچائے وہ قرآن حکیم کے مطابق ہونی چاہئیں اور اس کے خلاف نہیں ہونی چاہئیں۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ مسلم میڈیا کو نہ صرف فہم قرآن اور فہم اسلام کی طرز کے دینی پروگرام باقاعدگی سے پیش کرنے چاہئیں بلکہ وہ کوئی بھی ایسا پروگرام پیش نہیں کرسکتا جو قرآن حکیم اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔

۴۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مطلب ہے لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔۔۔ یہ وہ بنیادی کام ہے جو معاشرے کی اصلاح کرنے اور اسے بگاڑ سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صاف فرمایا ہے کہ تم سے پہلی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ وہ یہ کام چھوڑ بیٹھی تھیں (المائدہ ۵:۷۹) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس کی بہت تاکید کی ہے۔ (سنن ترمذی) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے تین درجے بیان فرمائے ہیں (صحیح مسلم) ایک یہ کہ جہاں مسلمان کے پاس طاقت ہو (اور اس کے طاقت کے استعمال

کا دائرہ کار ہو) وہاں اسے قوت سے برائی کو روک دینا چاہئے اور نیکی کا حکم دینا چاہئے (جیسے مثلاً حکومت ہے کہ اس کے پاس قوت و اختیار ہے تو اسے ریاست میں بُرائی کو قوت سے روکنا چاہئے یا جیسے مثلاً والد ہے کہ اسے حق حاصل ہے کہ اولاد کو بگڑنے نہ دے اور بُرے کام نہ کرنے دے)۔ البتہ جہاں آدمی کے پاس یہ اختیار نہ ہو وہاں اسے زبان سے معروف کی تلقین اور بُرائی سے بچنے کی تنبیہ کرنی چاہئے اور اس کا سب سے نچلا درجہ یہ ہے کہ مسلمان کم ازکم دل میں تو بُرائی کو بُرا سمجھے خواہ زبان سے اس کا اظہار نہ کر سکے۔

جہاں تک اس اصول کے میڈیا پر اطلاق کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایک صحافی کی پروفیشنل زندگی اس کی مظہر ہونی چاہئے کہ وہ اپنی تحریروں، تقریروں اور اپنے پروگراموں کے ذریعے لوگوں کو نیکی کی تلقین کرے اور بُرائی سے بچنے کا کہے بلکہ اس کے پروگراموں میں بُرائی کا کوئی پہلو ہونا ہی نہیں چاہئے۔

۵۔ تزکیہ و تربیت

جس چیز کو قرآن حکیم نے تزکیہ کہا ہے اسے ہم اپنی زبان میں تربیت کہتے ہیں۔ 'تعلیم و تربیت' کی اصطلاح اسی لئے بنی ہے اور تعلیم اور تربیت کو اسی لئے یکجا استعمال کیا جاتا ہے کہ تعلیم بنیادی ترین ذریعہ ہے تربیت کا اور تربیت ہی تعلیم کی غایت اور اس کا ہدف ہوتی ہے۔ سادہ الفاظ میں تزکیہ و تربیت کا مفہوم ہے انسانی شخصیت کا تعلیم کے مطابق ڈھل جانا مثلاً 'نماز پڑھنی چاہئے' یہ علم ہے لیکن نماز پڑھ کر دکھانا، اس کا اہتمام کرنا اور نماز عملاً پڑھوانا یہ تربیت ہے۔ انگریزی میں اس کا قریب ترین مفہوم ٹریننگ (training) کے لفظ سے ادا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ اصل چیز تزکیہ و تربیت ہے یعنی انسان کا اپنے نفس کو بُرے رجحانات و میلانات سے پاک کر لینا، اس کا اپنے نفس کی ایسی تربیت کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا اس کے لئے آسان ہوجائے اور اس کی عادت بن جائے۔ اس مختصر وضاحت سے ظاہر ہے کہ تزکیہ و تربیت، تعلیم سے ایک زائد چیز ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں تعلیم دینے والا محض معلم نہیں بلکہ مربی بھی ہوتا ہے۔

مسلم معاشرے میں اس اصول کا نہ صرف رسمی اور باقاعدہ تعلیم پر اطلاق ہوتا ہے بلکہ معاشرہ اور اس کے افراد رسمی تعلیم کے علاوہ بھی تزکیہ و تربیت کے مکلف ہیں کیونکہ اگر نفس انسانی دین کے مطالبات پر عملاً سر جھکانے کو تیار نہ ہو تو ایمان کا اقرار بے معنی اور محض دعویٰ بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے جب اپنے اندر اسلام پر عمل کرنے کے لحاظ سے خامیاں دیکھیں تو انہوں نے اپنے تزکیے کے لئے اور اپنی ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے 'تصوف' کے نام سے ایک ادارہ بنایا تاکہ وہ اپنی صحیح تربیت کرسکیں۔ آبادیوں کے شور وشغب سے دور اس طرح کی تربیت گاہ (خانقاہ) کے سربراہ کو لوگ مرشد (یعنی صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرنے والا) یا مربی (تربیت کرنے والا) یا مزکی (تزکیہ کرنے والا) کہتے تھے۔ اس اصول کا اگر ہم میڈیا پر اطلاق کریں تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میڈیا کا ہدف محض تعلیم یا معلومات بہم پہنچا دینا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے لوگوں کی تربیت کرنا چاہئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا میڈیا اس وقت بھی لوگوں کی 'تربیت' کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ غیر اسلامی تربیت کر رہا ہے جبکہ اسے ان کی اسلامی تربیت کرنی چاہئے۔ میڈیا لوگوں کی اسلامی تربیت کیسے کرے؟ یہ ایک مستقل اور تفصیل طلب موضوع ہے۔ تاہم ہمارے اس مضمون سے بھی اس کے خدوخال، ان شاء اللہ، واضح ہوجائیں گے۔

٦۔ ذاتی کردار

جب صحافی کا کردار ایک معلم اور مربی و مزکی کا ہے تو جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ معلم اور مربی کی بات میں اس وقت تک وزن اور اثر پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ خود اس پر عمل نہ کرے لہٰذا ضروری ہے کہ ہر صحافی کی نیت او رقبلہ درست ہو اور اس کی عملی زندگی رذائل و معصیت سے پاک ہو کیونکہ اس کی بات میں اثر اسی وقت پیدا ہوگا جب بات اس کے دل سے نکلے اور صرف حلق کے اوپر اوپر سے خارج نہ ہو۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اصول وضع کردیا کہ وہ بات نہ کہو جس پر تمہارا عمل نہ ہو (الصّف ٦١: ٣) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو دوسروں کو نیکی کی تلقین کرے اور خود عمل نہ کرے تو وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔ (صحیح

بخاری و صحیح مسلم) لہٰذا ضروری ہے کہ صحافی کا ذاتی کردار اجلا ہو اور وہ رذائل اخلاق سے پرہیز کرے۔

۷۔ مثبت تفریح

تفریح، کھیل اور مشغلے انسانی فطرت کی ضرورت اور اس کا حصہ ہیں لہٰذا ان کا اہتمام ضروری ہے لیکن اس حوالے سے چند اصول پیش نظر رہنے چاہئیں:

اوّل: کھیل اور تفریح ایک با مقصد زندگی کا جزو ہیں لیکن ان کی حیثیت آٹے میں نمک جیسی ہونی چاہیئے مطلب یہ کہ کھیل اور تفریح برائے زندگی نہ کہ زندگی برائے کھیل اور تفریح۔ اس اصولی بات کو ذہن میں رکھ کر افراط وتفریط سے بچنا چاہیئے۔

دوم: کھیل اور تفریح مثبت، تعمیری، پاکیزہ اور مفید ہونی چاہیئے تا کہ ان سے جسم مضبوط ہو، روح کو پاکیزگی اور جلا ملے اور اچھی عادتیں پروان چڑھیں۔

سوم: کھیل، مشغلے اور تفریح ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو نفس حیوانی کو ابھارے، جس سے اخلاق خراب ہوں اور بُری عادتیں پروان چڑھیں جیسے مثلاً کھیلوں اور تفریح کو مقصد زندگی بنالینا اور ان کو بہت زیادہ وقت اور توجہ دینا۔ عورتوں اور مردوں کی مخلوط کھیلیں یا عورتوں کا مردوں کے لئے ناچنا گانا اور یوں عریانی و فحاشی کو فروغ دینا جس کا آخری اور لازمی نتیجہ عورتوں اور مردوں میں غیر قانونی جنسی تعلق ہے جو صالح معاشرے کے قتل کے مترادف ہے اور بہت سے مفاسد کو جنم دیتا ہے۔

۸۔ مقامی عرف و عادات

ہر انسانی معاشرے میں مقامی طور پر ایسے عرف و عادات رواج پا جاتے ہیں جو زندگی کو آسان، ہموار اور پُر لطف بناتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی چیز خلاف احکام الٰہی اور خلاف مقاصد شریعت نہ ہو تو ان کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ خود قرآن اس اسلوب کی تائید کرتا ہے (البقرہ ۲:۱۷۸) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ مبارکہ سے بھی ہمیں اسی کی رہنمائی ملتی ہے (مسند احمد ۱:۲۷۹) لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے:

ایک: یہ کہ مقامی اعراف و عادات تعمیری اور صالح ہوں اور شریعت کے احکام اور مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔ نیز وہ خلاف فطرت سلیمہ اور شائستگی و پاکیزگی کے منافی نہ ہوں۔

دوسرے: مقامی عرف و عادات کو چھوڑ کر غیر مسلموں اور غیر قوموں کے ایسے اعراف و عادات کی نقالی نہ کی جائے جو مقامی اعراف و اقدار اور ان کی حکمتوں کے خلاف ہوں جیسے مثلاً ڈراموں اور فلموں میں مقامی لباس اور کلچر کی بجائے مغربی یا بھارتی کلچر دکھانا۔

۹۔ اچھی صحبت

ذرائع ابلاغ کے ساتھ وقت گزارنا ایک طرح سے ان کی صحبت اختیار کرنا ہی ہے اور اللہ و اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اچھی صحبت اختیار کرو اور بُری صحبت سے بچو۔ قرآن مجید میں حکم ہے کہ سچے لوگوں کی معیت میں رہو (التوبہ ۹:۱۱۹) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبردار کیا کہ دوستی کرنے سے پہلے دیکھو کہ کس کے ساتھ دوستی کر رہے ہو کیونکہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے (سنن ترمذی، کتاب الزھد) اور ان کے اثرات قبول کرتا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطر فروش کی دی جس کے ہاں کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہوتے ہیں اور بُری صحبت کی مثال لوہار کی دی جس کی دوستی میں دھوئیں سے پالا پڑنے اور کپڑے جھلسنے کا خطرہ ہوتا ہے (صحیح بخاری، کتاب الذبائح) ذرائع ابلاغ کے ساتھ وقت گزارنا بھی ایک طرح کی صحبت ہے کہ آدمی جس طرح کے پروگرام دیکھے گا ویسے ہی اثرات اس کی شخصیت پر پڑیں گے۔ اچھے پروگراموں کے اچھے اثرات اور بُرے پروگراموں کے بُرے اثرات۔ لہٰذا میڈیا کا فرض ہے کہ وہ صالح جلیس بنے اور اس کی صحبت انسانوں کے اخلاق پر مفید اور تعمیری اثرات چھوڑے لہٰذا میڈیا کو صرف ایسے پروگرام پیش کرنے چاہئیں جو اچھی صحبت کے زمرے میں آئیں۔

۱۰۔ تعصّبات کی حوصلہ شکنی

اسلام مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینا چاہتا ہے اور مسلم معاشرے میں یک جہتی اور محبت کو پروان چڑھانا چاہتا ہے چنانچہ قرآن حکیم نے فرمایا کہ مسلمان آپس

میں بھائی بھائی ہیں (الحجرات ۴۹:۱۰) اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال جسد واحد کی سی ہے کہ ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے (صحیح بخاری، کتاب الادب) اس لئے ذرائع ابلاغ کو ایسے پروگرام پیش کرنے چاہئیں جو مسلمانوں میں اخوت و محبت کو فروغ دیں اور ان سب تعصّبات کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے جن سے مسلمانوں میں بُعد اور دوری پیدا ہو اور انتشار و افتراق کو ہوا ملے خصوصاً فرقہ واریت اور مسلک پرستی، صوبائیت اور علاقائیت، زبان اور رنگ، برادری اور قبیلے کے تعصّبات کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

۱۱۔ خبر کی صحت کا خیال رکھنا

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خبر اور اطلاع کا ذریعہ صحیح اور درست ہونا چاہئے اور اگر اس بارے میں ذرا بھی شک ہو تو اچھی طرح سے جانچ پڑتال کر لینی چاہئے تاکہ غلط خبر کی بنیاد پر کسی کو نقصان نہ پہنچ جائے (الحجرات ۴۹:۶) اور خبر دینے والے کو بعد میں ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑے یا اعتذار نہ کرنا پڑے جیسا کہ آئے دن ہم اخبارات میں لوگوں کی تردیدیں اور اعتذارات پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام تفتیشی یا تحقیقی پورٹنگ (investigating reporting) کا داعی ہے اور یہ درست رویہ نہیں ہے کہ صحافی جو بھی بات سنے وہ نشر کر دے یا لکھ دے جب تک کہ اس کا ثقہ ہونا اس کے نزدیک یقینی نہ ہو۔

۱۲۔ ہمیشہ اچھی، سچی اور تعمیری بات کہنا

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں (اور مسلمان صحافیوں) کے لئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور ہمیشہ صاف، سیدھی، سچی اور کھری بات کہیں (الاحزاب ۳۳:۷۰) عربی میں سدید کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور سدّ کہتے ہیں روکنے کو (عربی میں پانی روکنے اور جمع کرنے کے لئے بنائے جانے والے ڈیم کو سدّ کہتے ہیں) اور سدید اس کاک یا ڈاٹ کو بھی کہتے ہیں جس سے بوتل کا منہ بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی چیز اس

کے اندر نہ جاسکے یا جو چیز اندر ہے وہ گر کر یا بہہ کر ضائع نہ ہوجائے۔ گویا جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قول سدید کہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے مکمل طور پر سچی اور کھری بات کہنا جس میں کوئی آلائش نہ ہو، فریب اور دھوکہ نہ ہو جس میں کوئی چکر نہ ہو بلکہ وہ مکمل طور پر صحیح، سچی اور تعمیری ہو۔

سطور بالا میں ہم نے ابلاغ کے ان ایجابی اور مثبت پہلوؤں اوراہم رہنما اصولوں کا ذکر کیا ہے جنہیں میڈیا سے متعلق افراد کو اپنی ابلاغی حکمت عملی میں اپنانا چاہئے اور اب ہم ابلاغ کے سلبی پہلوؤں اوران اصول و اقدار کا ذکر کریں گے جنہیں اہل صحافت کو اپنی ابلاغی حکمت عملی میں نہیں اپنانا چاہئے بلکہ انہیں رد اور ترک کردینا چاہئے جسے ہم ضابطۂ اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں۔

ابلاغ کے سلبی پہلو (Donts یعنی نہ کرنے کے کام) یا ضابطۂ اخلاق

ا۔ فحاشی و عریانی اور رقص و سرود

سارے مسلمان جانتے ہیں کہ اسلام عورت کو پردے کا حکم دیتا ہے، (الاحزاب ۳۳:۵۹) حیاء کی تلقین کرتا ہے (النور ۲۴:۳۱) مردوں کو بھی غض بصر (نظریں نیچی رکھنے) اور غیر محرم عورتوں کو دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ (النور ۲۴:۳۰) یہ بھی ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام تصویر بنانے کی مذمت کرتا ہے (صحیح بخاری، بدء الخلقِ) اور ایکٹنگ (سوانگ بھرنا، دوسروں کے کردار ادا کرنا) کو بُرا سمجھتا ہے عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالس کو ناپسند کرتا ہے اور (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ) گانے بجانے، رقص و سرود، شراب نوشی (المائدہ ۵:۴۹) اور زنا (بنی اسرائیل ۱۷:۳۲) کی مذمت کرتا ہے۔ یہ سب باتیں مسلمانوں کے ہاں متفق علیہ ہیں۔ قرآن وسنت میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں، ہمارے فقہاء اور محدثین ان میں متفق ہیں اور ان کے درمیان ان امور میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ماضی میں بعض مسلمان بادشاہوں اور خلفاء کے درباروں اور طبقۂ امراء میں ان ممنوعات میں سے بعض چیزیں مروج رہی ہیں لیکن علماء وصلحاء ہمیشہ اس کی مذمت ہی کرتے رہے ہیں اور عام

مسلمان بھی ان امور کو دینی تعلیمات سے انحراف ہی سمجھتے اور انہیں ناپسندیدگی کی نظر ہی سے دیکھتے رہے ہیں۔

پھر ایک چیز ہے ذاتی زندگی میں کوئی فحش کام کرنا، فحش بات کہنا یا عریانی اختیار کرنا اور ناچنا گانا اور ایک چیز ہے معاشرے میں عریانی و فحاشی اور رقص و سرود پھیلانا۔ اگرچہ پہلی حرکت بھی معصیت، گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہے اور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے لیکن یہ چیز کہ آدمی معاشرے میں فحاشی و عریانی اور رقص و سرود پھیلائے یہ پہلے کے مقابلے میں بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود ہی بُرائی نہیں کر رہا بلکہ دوسروں کو بُرائی پر اکسانے میں مشغول ہے۔ یہ اتنا شنیع فعل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ جو لوگ مسلمانوں میں فحاشی و عریانی پھیلاتے ہیں انہیں میں دنیا اور آخرت دونوں میں دردناک عذاب دوں گا۔(النور ۱۹:۲۴)

آج دنیا میں مغربی تہذیب غالب ہے(اس کے غلبے کی وجہ زندگی کے بعض مثبت اصولوں پر ان کا عمل کرنا ہے) اور اس کی معاشرت اور ثقافت میں مذکورہ بالا سارے عیب پائے جاتے ہیں جو ہم مسلمانوں کے نزدیک غلط اور مردود ہیں کیونکہ یہ خلاف اسلام ہیں اور مسلم معاشرت و ثقافت کے اصولوں کی نفی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ ان کے اندر بھی وہ خوبیاں اور صلاحیتیں پیدا ہو جائیں جو دنیا میں ترقی اور آخرت میں کامیابی کے لئے ضروری ہیں اور وہ مغرب کی اس معاشرت اور ثقافت کی پیروی نہ کریں جو خلاف اسلام و شریعت ہے لیکن بدقسمتی سے بعض مسلمان (خصوصاً میڈیا مالکان) اس کے باوجود مغربی معاشرت و ثقافت کی پیروی اور نقالی پر مصر ہیں۔ شائد شیطان انہیں اس پر اکساتا ہے یا مغربی اقوام کی مالی ترغیب اور ان کی ایجنٹ مقامی حکومتوں کی حمایت اور دولت کی حرص انہیں اس پر اکساتی ہے یا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ترقی یافتہ مغرب کی پیروی کر کے وہ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے۔ بہرحال مسلم میڈیا مالکان کا یہ رویہ کہ وہ اپنی ابلاغی پالیسی میں مغربی تہذیب اور اس کی ہم نوا ہندو تہذیب کی پیروی کرتے ہیں،

خلاف اسلام، سخت قابل مذمت اور قطعاً نا قابل قبول ہے۔بعض علماء بکراہت مسلمانوں کو ریڈیو سننے، ٹی وی دیکھنے اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی مسلمانوں کوتلقین کرتے ہیں کہ وہ اس دوران ان چیزوں سے احتراز کریں جوصریحاً خلاف اسلام ہیں۔

فحاشی وعریانی پھیلانا پاکستانی آئین وقانون کی رو سے بھی ناجائز اورغیر قانونی ہے لہٰذا حکومت پاکستان اوراس کے متعلقہ اداروں کی دینی اور اخلاقی کے علاوہ قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ میڈیا مالکان سے ان قوانین کی پابندی کروائیں اور دینی عناصراورسول سوسائٹی کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کومجبور کریں کہ وہ عریانی وفحاشی کے خلاف ان قوانین پرعمل درآمد کرائے۔ دینی عناصر اورسول سوسائٹی اگر متحد اور منظم ہوجائے تو میڈیامالکان کوبھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ عریانی اورفحاشی ختم کریں اورمسلمان معاشرے میں بگاڑ وفساد پیدا نہ کریں۔

خلاصہ یہ کہ عریانی اورفحاشی جو ہر پاکستانی ٹی وی چینل پھیلا رہا ہے(الا ما شاء اللہ) صریحاً خلاف اسلام ہے اور میڈیا مالکان کو خدا کا خوف کرنا چاہئے کہ وہ اپنی عاقبت خراب نہ کریں اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں فحاشی پھیلانے والوں کو واضح الفاظ میں عذاب الیم کی جودھمکی دی ہے وہ اس کے مصداق نہ بنیں اور مسلمانوں کے دین وایمان خراب نہ کریں اور ان کی معاشرت برباد نہ کریں۔

۲۔ لھوولعب

لھو ولعب کا مطلب ایسی تفریحی سرگرمیوں میں مصروف ہوجانا ہے جو مفید اورتعمیری نہ ہوں بلکہ جن سے وقت ضائع ہوتا ہواور خیر کے کام اور مفید اورتعمیری سرگرمیاں نظرانداز ہوتی ہوں، ان کے لئے وقت نہ بچتا ہو اور یوں ان پر منفی اثر پڑتا ہو۔لھو ولعب کی قرآن حکیم بھی مذمت کرتا ہے(الانعام ۳۲:۶) اور نبی کریم ﷺ سے بھی اس کی مذمت ثابت ہے(سنن ترمذی) بدقسمتی سے ہمارا میڈیا مغربی اور ہندوتہذیب کی پیروی اور نقالی میں بکثرت ایسے پروگرام پیش کرتا ہے جولھو ولعب کی نوعیت کے ہوتے ہیں اورجن سے پرہیز کرنا چاہئے۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ انسان کی زندگی میں وقت بہت قیمتی ہوتا ہے بلکہ اب تو دنیاوی کاموں کے تجربے سے بھی انسان نے یہی سیکھا ہے کہ وقت بہت قیمتی ہے چنانچہ جس چیز کو ہم تنخواہ کہتے ہیں وہ درحقیقت ہمارے وقت کی قیمت ہی ہوتی ہے جس آدمی کی زندگی جتنی بامقصد ہو وہ اتنا ہی مصروف ہوتا ہے اور اس کا وقت اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے لہٰذا کوئی سمجھدار انسانی وقت کے ضیاع کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایک سچا مسلمان با مقصد زندگی گزارتا ہے اور لھو ولعب میں وقت ضائع کرنا اسے ہرگز اچھا نہیں لگتا۔ لہٰذا ایک مسلمان صحافی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی لھو ولعب میں مشغول نہ ہو اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی کوئی ایسی تحریر نہ لکھے، کوئی ایسی بات نہ کہے اور کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کرے جو لھو ولعب کی نوعیت کا ہو۔

۳۔ شریعت کی بالادستی کی نفی

اسلامی عقیدے کی رو سے اور اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے اور مسلمان اللہ کا ایک حقیر بندہ ہوتا ہے جس کا کام اپنے خالق و مالک کے آگے جھکنا اور اس کی اطاعت کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم اور قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے (قرآن حکیم کی شکل میں یا اس کے مبعوث کردہ نبی کی سنت کی صورت میں) وہ ایک مسلمان کے نزدیک یقینی طور پر صحیح، قابل عمل اور قابل نفاذ ہوتا ہے اور اس پر انگلی اٹھانے، اعتراض کرنے، اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور اس کے نفاذ میں روڑے اٹکانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لئے مسلم میڈیا سے متعلق ہر فرد کا رویہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شریعت (اللہ کے قانون) کی بالادستی کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ اس کی حمایت کرے اور اسے معاشرے میں پروان چڑھائے اور ہرگز ایسا کوئی پروگرام پیش نہ کرے اور اس کی زبان اور قلم سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے شریعت کی بالادستی کا اصول مجروح ہوتا ہو یا اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہوں کیونکہ ایک مسلمان جو اللہ کے سامنے ایک عبد کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے آگے دن میں پانچ وقت جھکتا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا اور ماتھا ٹیکتا ہے اسے کہاں یہ زیب دیتا ہے کہ وہ شریعت الٰہی کے احکام پر اعتراضات

کرے یا ان کا استخفاف کرے۔

۴۔ آئین کی خلاف ورزی

اگرچہ اسلام میں تقدس قرآن وسنت کو حاصل ہے نہ کہ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون یا آئین کو تاہم انسان کا بنایا ہوا آئین اور قانون اگر قرآن وسنت کے مطابق ہو، قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہو اور قوم کے نمائندوں کا اس پر اتفاق ہو تو اجتماعی مصالح کی خاطر اس کی اطاعت کرنی چاہئے اور اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ لہٰذا میڈیا کے کردار کے حوالے سے پاکستان کے آئین اور قوانین میں جو کچھ درج ہے اس کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس کی اطاعت اور پیروی ضروری ہے۔ پاکستان کا آئین تقاضا کرتا ہے کہ شریعت کے احکام پر عمل کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ فحاشی و عریانی نہ پھیلائی جائے، پاکستان کے استحکام وتحفظ کا خیال رکھا جائے اور کسی کی پگڑی نہ اچھالی جائے ۔۔۔۔تو میڈیا کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ آئین پاکستان کی پابندی کرے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

۵۔ دارالاسلام کے مصالح کی خلاف ورزی

پاکستان ہمارا وطن ہے اور دارالاسلام ہے۔ اگرچہ پاکستان کے آئین وقانون میں درج بعض باتیں اسلامی لحاظ سے غیر معیاری اور ناقص ہیں لیکن بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہے، بایں معنی کہ وہ قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہے اور اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس میں نفاذ حدود کا ذکر موجود ہے، زکوٰۃ وعشر اور احترام رمضان کے قوانین موجود ہیں، علماء کرام سے مشاورت کا اہتمام موجود ہے۔۔۔۔اسی طرح پاکستانی معاشرہ بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کی کوشش کرتا ہے گو اس میں بھی کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پاکستان قانوناً اور شرعاً دارالاسلام ہے، ایک اسلامی ملک ہے اور اس کی حفاظت اور اس کے مصالح کی حفاظت ہر مسلمان پاکستانی پر واجب ہے لہٰذا میڈیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام، نظریۂ پاکستان اور پاکستان کے استحکام

وتحفظ کو یقینی بنائے اور اس کے مصالح کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کرے اور کوئی مسلمان صحافی ایسی تحریر نہ لکھے اور تقریر نہ کرے جس سے پاکستان کے مفادات کو زک پہنچتی ہو۔

۶۔ غیر اسلامی افکار، تصورات اور اقدار کو گلیمرائز نہ کیا جائے

میڈیا ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جو اگر چاہے تو بعض افکار، تصورات اور اقدار کو آسمان پر چڑھادے اور چاہے تو انہیں پاتال میں گرا دے۔ لہٰذا میڈیا کو چاہئے کہ وہ اسلامی تصورات اور اقدار کو گلیمرائز کر کے پیش کرے اور انہیں خوبصورت اور جاذب نظر بنا کر قارئین کے سامنے لائے تا کہ لوگوں کو ان پر عمل کی ترغیب ملے۔اور اس کے برعکس غیر اسلامی افکار و تصورات کو گلیمرائز کر کے پیش نہ کرے بلکہ ایسی صورت میں پیش کرے کہ لوگوں کا دل ان کو رد کرنے کو چاہے اور وہ بُرائی سے نفرت کرنے لگیں۔

۷۔ افواہیں نہ پھیلائی جائیں

قرآن حکیم افواہ پھیلانے کی مذمت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ معاملہ پہلے ذمہ داروں کے علم میں لایا جائے اور وہ تحقیق کریں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ پھر ہی بات آگے پھیلائی جائے۔(الحجرات ۶:۴۹)اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ جو سنے بلا تحقیق آگے پھیلا دے۔(صحیح مسلم) یہ اسلامی احکام تقاضا کرتے ہیں کہ کوئی بات کہنے، لکھنے اور پھیلانے سے پہلے اس کی تحقیق و تصدیق کی جائے کہ وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا میڈیا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر خبر کی پہلے تصدیق کرے اور بے بنیاد خبروں کی تشہیر، بے پر کی اڑانے اور اپنی رائے اور خواہش کو خبر بنا کر پیش کرنے سے احتراز کرے۔

۸۔ اسلام اور مسلم دشمن طاقتوں کے مفاد کی رعایت نہ کی جائے

مسلمان کی دوستی اور دشمنی کا معیار اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کردیا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار ومشرکین اور یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو کیونکہ وہ

تمہارے دشمن اور بدخواہ ہیں اور کبھی تمہارا غلبہ نہیں چاہتے (التوبہ ۹:۲۳) اور مسلمانوں کے بارے میں فرمایا کہ تمہارے درمیان اخوت اور بھائی چارہ ہونا چاہئے (الحجرات ۴۹:۱۰) تجربے نے بھی یہی بتایا ہے کہ یہود (اسرائیل)، نصاریٰ (یورپ و امریکہ) اور مشرکین (بھارت و روس وغیرہ) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے اسلام اور مسلم دشمنی کی۔ مسلمان علاقوں پر قبضہ کر کے ان کے جان و مال کو لوٹا اور انہیں غلام بنایا۔ فلسطین، کشمیر اور چیچنیا کے مسلمان ابھی بھی ان کے شکنجے میں تڑپ رہے ہیں اور حال ہی میں عراق اور افغانستان کی تباہی، پاکستان پر امریکہ کے حملے اور ایران پر شدید دباؤ سب کے سامنے ہے۔ لہٰذا ان ممالک کے ساتھ دوستی کرنا، ان کے مفادات کا خیال رکھنا اور ان کی بے جا حمایت کرنا اسلام، مسلمانوں اور پاکستان سے غداری کے مترادف ہے۔ان ممالک کے ساتھ تعلقات محتاط اور رسمی ہونے چاہئیں اور ان کے شر سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۹۔ معاشرے میں انتشار وتشتت کو ہوا دینا

اسلام میں مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق اور باہم تعاون کی تلقین کرتا ہے اور ہر اس پروگرام سے روکتا ہے جس سے معاشرے میں تفرقہ پیدا ہو۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں میں مہاجر و انصار (یعنی مقامی اور غیر مقامی) کی بنیاد پر تفریق کی کوشش کو جاہلیت قرار دے کر اس کی مذمت فرمائی لہٰذا ہر قسم کے مسلکی اختلافات اور زبان، رنگ، نسل، علاقے ۔۔۔ وغیرہ کے تعصّبات کو ہوا دینا جرم ہے اور مسلمان میڈیا کا ان سے احتراز لازمی ہے۔

تلخیص بحث

قرآن وسنت کے حوالے سے ذرائع ابلاغ (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ ابلاغ میں تقریر، تحریر اور سمعی و بصری ذرائع سب شامل ہیں مثلاً علماء کرام کے وعظ خصوصاً جمعہ کی تقریریں، اخبارات، جرائد، کتب، ریڈیو، ٹی وی [بشمول ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں]، انٹرنیٹ، موبائل ۔۔۔وغیرہ) کے کرنے اور نہ کرنے والے کاموں کے تفصیلی ذکر کی روشنی میں ایک ہم عصر مسلم ریاست کی میڈیا پالیسی کے رہنما اصول اور میڈیا کے لئے ضابطہ اخلاق بآسانی وضع کئے جا

سکتے ہیں جو یہ ہیں:

پاکستانی میڈیا کے لئے رہنما اصول

مسلم ذرائع ابلاغ کو جن اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین اسلام جو ہمارا نظریۂ حیات ہے اس کی تعلیمات لوگوں تک پہنچانا

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۳۔ غیر اسلامی افکار و اقدار کا رد

۴۔ لوگوں کی اخلاقی اصلاح اور تربیت

۵۔ فرقہ واریت اور لسانی و علاقائی تعصّبات کی حوصلہ شکنی

۶۔ اسلام، پاکستان اور مسلم دشمن قوتوں کے ایجنڈے کا رد اور بیخ کنی

۷۔ مثبت اور تعمیری تفریح مہیا کرنا

۸۔ مقامی عادات اور صالح اعراف کا لحاظ رکھنا

۹۔ خبر کی صحت جانچنے کا اہتمام کرنا

۱۰۔ ہمیشہ اچھی، سچی اور تعمیری بات کرنا

ضابطۂ اخلاق

اس سے مراد ہے وہ امور جن سے میڈیا کو احتراز کرنا چاہئے۔ ان کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ ذرائع ابلاغ کو کوئی ایسی تقریر، تحریر اور پروگرام پیش نہیں کرنا چاہئے جن سے اسلامی تعلیمات کی نفی ہوتی ہو ان کا استخفاف ہوتا ہو اور ان پر عمل نہ کرنے کی ترغیب ملتی ہو۔

۲۔ نظریۂ پاکستان کو زک پہنچتی ہو، (نظریۂ پاکستان سے مراد یہ ہے کہ پاکستان اس لئے بنایا گیا ہے کہ یہ اسلام کا قلعہ بنے اور اس میں اسلامی اصول و اقدار پر عمل ہو) اور پاکستان کے تحفظ، استحکام اور مفادات پر حرف آتا ہو۔

۳۔ فحاشی و عریانی پھیلتی ہو اور رقص و سرود کو فروغ ملتا ہو۔

۴۔ لھو ولعب کو فروغ ملتا ہو، وقت ضائع ہوتا ہو اور بے مقصدیت پھیلتی ہو۔

۵۔ اسلامی اقدار کی نفی ہوتی ہو۔

۶۔ غیر اسلامی اقدار و افکار جیسے سیکولرزم، لبرلزم، کمیونزم، ہندوازم وغیرہ کی اشاعت ہوتی ہو۔

۷۔ فرقہ واریت اور لسانی، علاقائی اور دیگر تعصّبات کو تقویت پہنچتی ہو۔

۸۔ اسلام، مسلم اور پاکستان مخالف قوتوں (امریکہ و یورپ، بھارت، اسرائیل اور روس) کی ہم

نوائی اور ان کے ایجنڈے اور مفادات کی حمایت ہوتی ہو۔

نفاذ کا طریق کار

۱۔ حکومت پاکستان خصوصاً وزارت ہائے اطلاعات، ثقافت اور مذہبی امور کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے رہنما اصول اور ضابطۂ اخلاق سٹیک ہولڈرز کی مشاورت سے وضع کرے اور اس کے نفاذ کے لئے قانون سازی کرے تاکہ اس کی خلاف ورزی پر عدالتیں سزائیں دے سکیں۔ دینی عناصر، سول سوسائٹی اور سٹیک ہولڈرز کو حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہئے کہ وہ یہ کام کرے۔

۲۔ جب تک حکومت یہ کام نہیں کرتی صحافیوں اور ان کی پیشہ ورانہ تنظیموں کو چاہئے کہ وہ باہم مشاورت سے اس طرح کے رہنما اصولوں اور ضابطۂ اخلاق کا تعین کر لیں اور ایک سپر وائزی کمیٹی بنالیں (اس کمیٹی کو کوئی موزوں نام دیا جا سکتا ہے مثلاً ڈسپلن کمیٹی) اور جب فرد یا تنظیم کو کسی صحافتی ادارے یا میڈیا کے خلاف شکایت ہو کہ وہ اس ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ اس ڈسپلن کمیٹی سے رجوع کر سکے۔ اس کمیٹی میں ایسے ذمہ دار افراد ہوں جن کا پروفیشن میں نام اور عزت ہو۔ سول سوسائٹی کے نیک نام اور صاحب کردار افراد اور اعلیٰ عدالتوں کے نیک نام ریٹائرڈ ججوں کو بھی اس طرح کی کمیٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

اس کمیٹی کے اختیارات کا تعین بھی کیا جانا چاہئے مثلاً یہ کہ وہ اپنے فیصلوں کو مشتہر کر سکے،

کچھ جرمانہ عائد کرسکے یا محدود مدت کے لئے اشاعت معطل کرسکے۔۔۔وغیرہ۔

۳۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کمیٹی کے فیصلے کے بعد کوئی اس معاملے کو ملکی عدالتوں میں لے جانا چاہے تو لے جائے جہاں عدالت کو اس کمیٹی کے فیصلے کی روشنی میں فیصلہ صادر کرنے میں آسانی ہوگی۔ **ھذا من عندنا و العلم عند اللہ۔**

باب العقائد علامہ احمد جاوید

اکتساب فضائل (۳)

تقدیر

س: تقدیر کا موضوع بہت پیچیدہ اور دشوار ہے۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں سے لغزش ہوئی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تقدیر پر گفتگو کرنے سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے۔ اس سارے پس منظر میں آپ ایسا کون سا موقف اختیار کریں گے جو محفوظ بھی ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد گرامی کے خلاف بھی نہ ہو؟

ج: اصل میں تقدیر کی حقیقت کے درپے ہو کر اسے ایک فلسفیانہ مسئلے کی طرح زیر غور لانا اور موضوعِ گفتگو بنانا نہ صرف یہ کہ خطرناک ہے بلکہ اس کا کوئی شافی نتیجہ بھی نہیں نکل سکتا۔ تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے بس وہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی لئے اس پر محض ایمان ضروری ہے، اس کا تفصیلی اور فلسفیانہ فہم درکار نہیں۔ یہ غیب ہے اور اس کا غیب ہونا کسی بھی کاوش سے زائل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ تقدیر یا مشیت اللہ کی مرضی کا نام ہے۔ جب ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لاؤ تو اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی پر راضی رہو۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کسی شے کو اللہ کی قدرت، خلاقی اور علم سے باہر نہ سمجھو۔ تقدیر پر ایمان کے یہ دو بڑے اجزاء ہیں۔ پہلی صورت میں بندگی کا کمال ہے اور دوسری میں اللہ کی ایمانی معرفت۔ ہمارا زیادہ زور سر دست تقدیر

بمعنی مرضی الٰہی پر ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احکام پر پورے عمل کے ساتھ نتائج کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اور اس پر کوئی شکایت یا فخر کئے بغیر راضی رہنا تقدیر پر ایمان کا لازمہ ہے۔

س: آپ کی باتوں کا کہیں یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ آدمی کفر اور فسق وغیرہ پر بھی راضی ہو جائے کیونکہ اللہ کی مرضی یہی ہے؟

ج: ہرگز نہیں! جن چیزوں پر اللہ راضی نہیں ہے ان پر بندہ کیسے راضی ہوسکتا ہے؟ کافر و فاسق مجبور نہیں ہوتے وہ اس شر کے مستحق ہوتے ہیں جو یقینا اللہ ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ اصول یاد رکھیں کہ شر ہمیشہ مستحق کو پہنچتا ہے لیکن خیر کے لئے استحقاق ضروری نہیں۔ یہ جملہ معترضہ تھا، ہماری مراد یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان ایک سادہ اور فطری مطالبہ ہے جس کے ذریعے سے بندے کی بندگی اور اللہ کی الوہیت وضاحت سے سامنے آتی ہے۔ اس ایمان کے دو بنیادی تقاضے ہیں: ایک یہ یقین کہ ہر شے خواہ اچھی ہو یا بری اللہ کے علم میں ہے، اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ یہ عقیدہ الوہیت کے بارے میں صحیح تصور فراہم کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میری کوششیں، خواہشیں اور تمنائیں پوری نہیں ہو رہیں تو یہ اللہ کی مرضی ہے، مجھے انہیں برقرار رکھتے ہوئے اللہ کی مرضی پر اس طرح راضی رہنا چاہیئے کہ کوئی شکایت اور مایوسی غلبہ نہ پا سکے۔ اسی جزو کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بندے کے کمالات اور کامیابیاں بھی تقدیری امور ہیں۔ ان پر اترانے کی بجائے تقدیر پر صحیح ایمان رکھنے والا انہیں اللہ کا فضل اور انعام سمجھ کر ایک عاجز اور محتاج بندے کی طرح شکر گزار رہتا ہے۔

باقی رہے وہ امور جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا تو ان کا تعلق تقدیر کی حقیقت سے ہے جس کی دریافت کے ہم مکلف نہیں ہیں۔ ان معاملات میں (مثلاً ابوجہل کافر کیوں تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نبی کیوں بنے؟) ہمارا کام بس یہ ہے کہ محض واقعاتی رخ سے ان کی تائید کریں اور ان کی سمجھ میں نہ آسکنے والی حکمتوں کو اللہ کے سپرد کر کے اعتراض اور تشکیک وغیرہ کی طرف مائل نہ ہوں۔ اللہ جو کرتا ہے وہی حق ہے اور وہی اچھا ہے، چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ

آئے۔ یہ تقدیر کی حقیقت پر ایمان کا خلاصہ ہے اور اس پر ہر طرح کا غور وفکر ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسے غور وفکر کی بنیاد لازماً کسی منفی محرک پر ہوگی۔

ہم نے یہ بات دہرا کر کہی ہے کہ تقدیر پر ایمان کے دو بڑے فوائد ہیں اللہ کی معرفت اور عبودیت کا کمال۔ امید ہے یہ دونوں پہلو ضروری حد تک واضح ہو گئے ہوں گے۔

ہاں! یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ اللہ کی مرضی ہر حال میں خیر سے نسبت رکھتی ہے شر سے نہیں یعنی شر اللہ کی مخلوق ہے، اس کی قدرت میں ہے، اس کے علم میں ہے لیکن اس کا پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ ناپسندیدہ چیز وہ سزا اور عذاب کے طور پر مستحقین پر مسلط کرتا ہے اپنے مطلق اختیار اور قوت کی بنیاد پر، جبر کی طرح اندھا دھند وارد نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسئلہ تقدیر میں بہت سے لوگ گمراہ ہوئے۔

س: اب یہ بات صاف ہوگئی کہ تقدیر پر ایمان کا وہ مفہوم کیا ہے جو ہر صاحبِ ایمان کے لئے فرض ہے۔ آپ کی گفتگو کا نتیجہ ایک پہلو سے غالباً یہ نکلتا ہے کہ ناکامیوں اور مصیبتوں وغیرہ کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر ان پر صبر کرنا چاہئے اور اپنی زندگی کو کسی بھی درجے میں مجروح اور متاثر نہیں ہونے دینا چاہئے۔ یہ ایک عملی اور اخلاقی نکتہ ہے جس کی افادیت بالکل روشن ہے لیکن ایک چیز تا حال سمجھ میں نہیں آئی کہ تقدیر کو صرف اللہ کی مرضی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اس میں تو خیر وشر دونوں ہیں۔ تقدیر کیا یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ہر شخص کا کفر و ایمان نیکی و بدی وغیرہ لکھ دی ہے اور اس کا خلاف ممکن نہیں؟

ج: آپ خود ہی دشواری میں پڑنا پسند کر رہے ہیں۔ بہر حال اس کا ایک جواب یہ ہے کہ تقدیر الٰہیہ کے دو حصے ہیں: علم اور قدرت۔ اللہ کے علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہے اور اللہ کی قدرت ہر معاملے میں حاوی ہے۔ کفر و ایمان وغیرہ کا تعلق علم الٰہیہ سے ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے کافر کو کفر پر اور فاسق کو حق پر مامور اور مجبور کر رکھا ہے۔ یاد رکھیں اللہ علیم وقدیر اپنی تمام صفات کے ساتھ ہے۔ مثال کے طور پر اس کا علم اس کی رحمت کا غیر نہیں ہے اور اس کی قدرت اس کے عدل کے منافی نہیں ہے اور عدل کی صفات رکھنے والی

ذات کی طرف سے کسی ذہن میں یہ وسوسہ آنا ہی نہیں چاہئے کہ اس کا کوئی فعل جبر عائد کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ تقدیر مخلوق کی مجبوری کی دستاویز نہیں ہے بلکہ مخلوق کے بارے میں خالق کے علم اور قدرت کا مظہر ہے۔ اس بات کو جتنا سمجھیں گے اتنا پریشان خیالی اور وساوس سے بچیں گے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو تقدیر پر ایمان بندگی کی ایک بنیادی ضرورت پوری کرتا ہے اور وہ ہے تسلیم و رضا یا صبر و شکر۔ بندگی اپنی ماہیت میں مالک کے ساتھ ایک غیر مشروط تعلق پر مبنی ہے یعنی بندہ اپنی کسی خواہش یا ضرورت کو شرط بنا کر اللہ کے ساتھ کوئی محدود تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا فریضہ بس یہ ہے کہ پرستش اور اطاعت کے ساتھ اللہ کے ہر فعل پر پوری طرح راضی رہے۔ یہ حالت تقدیر پر ایمان رکھے بغیر ممکن نہیں۔ گویا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ تقدیر پر ایمان لانا بندگی کا لازمہ ہے اس کے بغیر بندہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔

س: اب بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی البتہ آپ نے جس تسلیم و رضا کا ذکر کیا ہے اس کی اگر مختصر تعریف بھی کر دیں تو بات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن ہو جائے گا۔

ج: تسلیم و رضا دراصل وہ حال ہے جو بندے کو یہ کہنے کے قابل بناتا ہے کہ یا اللہ! آپ کا ہر حکم اور آپ کی ہر مرضی سر آنکھوں پر۔ یعنی جو آپ فرمائیں، جو آپ چاہیں میں اس کے لئے حاضر ہوں، میں اس پر راضی ہوں۔ اس میں تسلیم کا تعلق حکم سے ہے اور رضا کا تعلق مشیت سے۔ بندے تک اللہ کی طرف سے یہی دو چیزیں پہنچتی ہیں ان کے آگے اپنی نفی کر دینا تسلیم و رضا ہے۔

ہاں! یہ خیال رہے کہ تسلیم و رضا کا یہ مطلب نہیں کہ بندہ سعی و کوشش میں ناکامی کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ میں اللہ کی مرضی پر راضی ہوں۔ ایک تو ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ کی حتمی مرضی کیا ہے اور دوسرے یہ کہ ترک عمل خود خلاف حکم ہے۔ حکم کی خلاف ورزی کر کے اللہ کی مرضی پر راضی ہونے کا دعویٰ محض ایک خود فریبی ہے۔ ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ نتائج کی ناموافقت ہمیں عمل میں مسلسل اشتغال اور کوشش میں متواتر مصروفیت سے نہ

روک سکے۔ یہ ہے حقیقی تسلیم و رضا۔

ڈاکٹر مشتاق گوہر

انسانی فکر و عمل میں قلب کا بنیادی کردار (۳)

دل کی ذہانت کا نظام

اس وقت تک کی بحث سے واضح ہے کہ سائنس دانوں کے نزدیک دل کی ذہانت کا دماغ سے الگ ایک اپنا نظام ہے جو کئی لحاظ سے دماغ کی ذہانت کے نظام سے منفرد ہے۔ انسانی دماغ کی حیثیت معلومات سٹور کرنے والے سنٹر(Data Strorage Center) جیسی ہے یہ سیدھے اور منطقی انداز میں کام کرتا ہے۔ انسانی دماغ کا اصل کام معلومات کو یاد کرنا، ان کا تجزیہ کرنا، ان کو متعلقہ خانوں میں سٹور کرنا اور موازنہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ معلومات ہمیں ہماری حسیات(Senses) سے حاصل ہوتی ہے۔ ماضی کی معلومات، تجربات اور یادداشتوں کی بنیاد پر ہماری حسیات سے مہیا ہونے والی نئی معلومات کو دماغ سٹور کرتا ہے۔ مغربی محقق ڈاک چلڈر(Doc Childre) کے مطابق گو کہ دماغ کا معلومات کا تجزیہ کرنے کا یہ طریقہ ہماری بقاء کے لئے اہم ہے لیکن اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔

چونکہ دماغ ہر نئی آنے والی معلومات کا سابقہ معلومات (جو پہلے سے دماغ میں موجود ہوتی ہیں) سے لاشعوری طور پر موازنہ اور مقابلہ کرتا ہے، اس لئے اگر کسی خاص طرز کی معلومات دماغ میں پہلے سے موجود ہوں تو دماغ انہیں قبول کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے اپنے سابقہ نظریات اور پرانی عادات سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا

ہے۔

اب جب معاملہ اللہ کی ذات پر ایمان کا آتا ہے تو دماغ اس مسئلے میں کنفیوز ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں قرآن میں فرمایا ہے: لیس کمثلہ شی (الشعراء: ۱۱) اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی بارے میں مشہور جرمن فلسفی کانٹ (Immanuel Kant 1742ء تا1804ء) نے اپنی مشہور کتاب ''*The Critique of Pure Reason*'' میں کہا تھا: ''خدا کی ذات کے ادراک کے بارے میں عقل انسانی بالکل ناکافی اور بے بس ہے''۔ دماغ چونکہ ہر نئی معلومات کا پرانی معلومات سے موازنہ کرتا ہے، اس لئے خدا کی ذات کے معاملے میں دماغ کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے وہ خدا کی ذات کا موازنہ کر سکے۔ اس لئے وہ خدا کی ذات کے بلاواسطہ (Direct) ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ دماغ اللہ کی ذات کا ادراک صرف اس کی تخلیقات پر غور وفکر کرنے سے ہی کر سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دماغ کی اِسی بے بسی کی طرف اشارہ کیا تھا جب آپؓ نے فرمایا تھا:

'اَلْعِجزُ عَنْ دَرْکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ'

اللہ کی ذات کا ادراک نہ کرسکنا ہی اس کا حقیقی ادراک ہے۔

اس کے برعکس انسانی دل انفارمیشن کی پیچیدگیوں میں کم ہی پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹارچ میں سے نکلنے والی روشنی کی شعاع اندھیرے کو چیرتی ہوئی سیدھی اس چیز پر پڑتی ہے جسے ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ محقق ڈاک چلڈر (Doc Childre) اور ہاورڈ مارٹن (Howard Martin) اپنی کتاب '*The Heart Math Solution*' (مطبوعہ نیو یارک 1999ء) میں لکھتے ہیں کہ انسانی دل کی ذہانت ایسی ہوتی ہے کہ وہ آنے والی معلومات کو منطق کی بجائے وجدانی (Intuitive) اور زیادہ بلاواسطہ (Direct) طریقے سے دیکھتی ہے۔

درحقیقت زندگی کی بہت سی ایسی حقیقتیں ہوتی ہیں جنہیں منطق سے اور عقل کے زور پر

نہیں سمجھا جا سکتا مثلاً غیب پر ایمان، خدا کی ذات پر ایمان، خدا کی ذات کا خوف وغیرہ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ایسی حقیقتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی دل کی ذہانت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کا خیال کرتی ہے(Humanistic Type) اور دوسروں کا درد محسوس کرتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا:

درد دِل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اس کے برعکس مشہور ماہر نفسیات میہالی (Mihaly) اپنی کتاب '*The Evolving Self*' میں لکھتا ہے کہ ''انسانی دماغ کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنے فنا ہونے سے خائف رہتا ہے اور صرف اپنی ذات کے متعلق سوچتا ہے۔ دماغ ہمیشہ بد سے بدتر کی توقع کرتا ہے اور اس کا میلان مایوسی کی طرف ہوتا ہے''۔

یعنی دماغ کی ذہانت خودغرض قسم کی ہوتی ہے۔ جسے صرف اپنی بقاء سے غرض ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں دماغ کی ذہانت کو آخرت کی بجائے دنیا کی فکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا تھا:

لیس العلم کثرة الروایات ولکن العلم نور قذفه اللہ بقلب المومن۔

یعنی علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ علم ایک نور ہے جسے اللہ مومن کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

حقیقی علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اللہ کی ذات کو پہچاننا، انسان کی تخلیق کے مقصد کو سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے اپنی کم مائیگی اور بے حیثیتی کو سمجھنے کا نام ہے۔ حقیقی علم کی کچھ ایسی ہی تعریف امام شافعیؒ نے بھی بیان کی تھی۔ جب آپؒ نے اپنے اشعار میں فرمایا تھا:

شکوت الی وکیع سوء حفظ
فارشدنی الی ترک المعاصی
واخبرنی بان العلم نور

ونور اللہ لا یعطی لعاصی

(دیوان شافعی)

میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں گناہوں کو چھوڑ دوں۔ اور انہوں نے مجھے بتایا کہ علم ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ یہ نور کسی گنہگار کو عطا نہیں کرتا۔

ان اشعار میں امام شافعیؒ دل کے حافظے کی بات کر رہے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ میں آتا ہے کہ ہر گناہ کی وجہ سے آدمی کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر آدمی گناہ سے توبہ کر لے تو وہ سیاہ دھبہ دل پر سے غائب ہو جاتا ہے وگرنہ مزید گناہ کرنے کی وجہ سے وہ سیاہ دھبے بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ انسان کا دل مکمل طور پر سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں امام شافعیؒ ذہن کے حافظے کی بات نہیں کر رہے کیونکہ وہ حافظہ تو بڑے بڑے سرکش اور گنہگار لوگوں کا بھی تیز ہوتا ہے لیکن اگر ان کا دل مردہ ہو تو وہ تیز ذہن ان کو جہنم کی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کے احکامات کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں علم کا نور ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل کا حافظہ تیز کر دیتا ہے اور اسے دین کی صحیح سمجھ عطا فرما دیتا ہے جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں آیا ہے:

'من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین'

اللہ تعالیٰ جس سے بہتری کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے

....

''معلوم ہونا چاہئے کہ انسانی جسم میں سب سے زیادہ اعلیٰ و افضل عضو دل ہے۔ یہی اللہ کو جانتا ہے، اس کے لئے عمل کرتا ہے اور اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اللہ کے قریب کرنے والا اور صاحب مکاشفہ بھی یہی ہے اور اعضاء اس کے تابعدار اور خادم ہیں۔ وہ ان سے اس طرح کام لیتا ہے جیسے بادشاہ غلاموں سے۔ یہ سچ ہے کہ جس نے اپنے دل کو پہچانا اس نے اپنے

رب کو پہچانا''۔ (علامہ ابن جوزی: منہاج القاصدین)

''گو کہ قلب جو روح کا کنٹرول سنٹر ہے وہ انسان کے جسمانی دل سے مختلف ہے لیکن دونوں کی کارکردگی کا آپس میں گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ دل میں جو خصوصیت بھی پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات تمام جسم کے اعضاء تک پھیل جاتے ہیں اور وہ اعضاء اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی جسم کے اعضاء اچھے یا بُرے جو عمل بھی کرتے ہیں ان کے اثرات دل پر مرتب ہوتے ہیں''۔ (امام غزالی: احیاء العلوم)

تفھیم مغرب ڈاکٹر محمد امین

مغربی فکر کی اساسیات (۳)

تجربیت (Empiricism):

تجربیت سے مراد ہے وحی اور عقل سے حاصل ہونے والے علم کے مقابلے میں حسیات سے حاصل ہونے والے علم کو یقینی اور حتمی ماننا۔ یہ تقابل شروع ہی سے فکر انسانی میں موجود رہا ہے۔ وحی کی برتری کو ماننے والے اہل مذہب ہیں، عقل کو منبع علم سمجھنے والے اکثر غیر مذہبی فلسفی ہیں جب کہ سائنس دان (اور سائنسی منہج پر مبنی دیگر علوم کے ماہرین) حسی علم کو حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ یونان قدیم کے سوفسطائی حسیات کو علم انسانی کا ماخذ سمجھتے تھے جب کہ افلاطون اور اس کے ہم خیال یہ سمجھتے تھے کہ ذہن بذات خود (حسی تجربے اور مشاہدے کی صداقت کے بغیر) صداقت کے انکشاف پر قادر ہے۔ رومیوں اور قرون مظلمہ سے گزر کر جب یہ علمی روایت احیائے علوم کے دور میں داخل ہوئی تو کائنات کی حقیقت سے متعلق دو نظریے وجود میں آئے۔ ایک وہ جو افلاطون اور ارسطو کی روایت کی یادگار تھا اور جس کی رو سے امثال حقیقی ہیں اور دوسرا وہ جس کی رو سے کائنات کی حقیقی اشیاء خاص اشیاء ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ پہلی روایت سے (عیسائی) مذہب نے اپنی تصدیق کا

کام لیا اور دوسری روایت نے جدید سائنس کی بنیادیں استوار کیں۔ سائنس میں گلیلیو اور فلسفے میں فرانسس بیکن ان رجحانات کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

بیکن کے نزدیک علم کا ماخذ حسیات ہیں اور علم صرف انسانی تجربے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے فلسفے کو مذہب سے جدا کر کے علم کو بے مصرف اور بے ثمر رجحان قرار دیا۔ تھامس ہوبز نے بھی حسیات ہی کو علم کا ماخذ قرار دیا اور سائنس اور فلسفے کو مذہب (علم کلام) سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ نیوٹن کی طرح جان لاک بھی تجربے اور مشاہدے سے علمی نتائج اخذ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ازلی و ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور حس ہی ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ اس نے ضمیر کے وجود کا بھی انکار کیا اور کہا کہ اخلاقی قوانین جبلی نہیں ہوتے بلکہ حسیات کے ذریعے حاصل کیے ہوئے علم کی روشنی میں ہم جو رائے (صحیح یا غلط) قائم کرتے ہیں وہی ضمیر ہے۔ سیاست میں وہ عوام کی حاکمیت کے نظریے کا علمبردار تھا۔ ہیوم نے جو اٹھارویں صدی کے تشکک کا امام تھا، لاک کے فلسفہ تجربیت کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ اس نے کہا کہ انسانی تجربہ ہی انسانی علم کا ماخذ ہے اور صرف انہی اشیاء کا وجود ہے جن کا ادراک کیا جا سکے۔ اس بناء پر اس نے نفس انسانی، روح اور خدا کا انکار کر دیا کیونکہ یہ تصورات قابل ادراک نہیں ہیں۔ انیسویں صدی میں کومتے، بنتھم اور ولیم جیمز نے ہیوم کے اثرات قبول کیے۔

کومتے کو ایجابیت (Positivism) کا بانی کہا جاتا ہے جو تجربیت ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کے نزدیک کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین انسانی مشاہدے اور تجربے ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اس اساس پر وہ انسان کو مرکز کائنات سمجھتا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا اور کسی وجود مطلق کو ماننا انسانی تجربے سے متجاوز ہے لہٰذا اس کے نزدیک ایک ہی وجود مطلق ہے اور وہ ہے انسانیت عالیہ لہٰذا صرف انسان کی فلاح و بہبود کی کوشش ہی نیکی ہے۔ اسی طرح کومتے کے نزدیک انسانی ذہن تین مراحل سے گزرا ہے: مذہب، مابعد الطبیعیات اور مرحلۂ ایجابیت یا سائنس۔ اس کے نزدیک مذہب اور مابعد الطبیعیات قصۂ پارینہ بن چکے ہیں اور اب سائنس کی خدائی کا دور ہے۔

امریکہ کے نتائج پسند فلاسفہ ولیم جیمز اور ڈیوی اور دوسرے دور کے تجربیت پسندوں میں سے جان اسٹوارٹ مل اور بنتھم کومتے کے افکار سے بہت متاثر ہیں۔ اسی طرح درخائیم، لیوی بروہل، تین اور رینان نے کومتے کے عمرانی نظریات کو بیسویں صدی میں نیا آہنگ دیا ہے۔

جان اسٹورٹ مل بھی جرمی بنتھم کی طرح افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے اور اس کی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ صرف لذت کی خواہش کی جاتی ہے اس لئے لذت ہی مستحسن ہے جب کہ بنتھم تو یہاں تک کہتا ہے کہ لذت ہی خیر ہے اور اذیت ہی شر ہے اور افادیت ہی ہر شے کا معیار ہے۔

امریکی نتائجیت (Pragmatism) کا شارح ولیم جیمز ہے جو لاک، ہیوم، کانٹ، پیرس اور کومتے کے افکار کا جامع تھا۔ ولیم جیمز کسی صداقت مطلق کا قائل نہیں تھا اور وجود مطلق کو ''مابعد الطبیعی عفریت'' کا نام دیتا تھا۔ اس کے خیال میں صرف وہی اشیاء موضوع بحث بن سکتی ہیں جو انسانی تجربے سے لی گئی ہوں۔ انسانی تجربہ ہی حقیقت ہے اور صرف انسانی مشاہدہ اور تجربہ ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ اس کے نزدیک نتائجیت ایک طریق فکر ہے جس کا مقصود کسی نوع کی ازلی صداقتوں کا کھوج لگانا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات سے انسانی تجربے یا طرزعمل میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آیا وجود مطلق ہے یا نہیں۔ جیمز کی افادیت اور نتائج پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ مذہب کو بھی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اس کے نزدیک ایمان کا جوہر نہ جذبہ ہے نہ عقل بلکہ ایمان لانے کا ارادہ ہے جسے سائنسی طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا۔ مذہب میں کسی صداقت مطلق کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا خدا، حیات بعد الموت اور قدر و اختیار پر عقیدہ رکھنے سے ہمیں کوئی عملی (دنیاوی) فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہوتو ان عقائد کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نتائجیت کا ایک مشہور شارح جان ڈیوی ہے جو جیمز ہی کی طرح فکر انسانی کو محض ایک آلہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی نظریے کی عملی کامیابی کی طرف رہنمائی ہی اس کی صداقت کا واحد معیار

ہے۔ انگلستان کے پروفیسر شلر نے نتائجیت کو انسان پسندی سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک جو کچھ بھی انسان کے لئے صحیح ہے اسے کسی مافوق الفطرت ہستی کی بجائے انسانی مفاد ہی کی پرورش کرنی چاہئے۔ گویا خدا کو بھی صرف اس لئے مانو کہ اس سے دنیوی فائدہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر سیکولرزم اور لادینیت کا تصور کیا ہوسکتا ہے کہ عملی کامیابی، نتیجہ خیزی اور افادیت کو افکار کی صداقت کا واحد معیار قرار دیا جائے بلکہ یہ تو محض کاروباری ذہنیت کی عکاسی ہے۔

تجربیت اور اس کی بعض ذیلی شاخوں کے اس مختصر بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تجربیت نے نہ صرف مذہب اور وحی کی برتری کو ردکیا بلکہ ادراک حقائق کا انحصار محض انسانی مشاہدے اور حسی تجربے کو قرار دے کر اسے ایک متبادل مذہب اور نظریۂ حیات بنا کر پیش کیا۔ اس نقطۂ نظر نے انیسویں اور بیسویں صدی میں نہ صرف سائنس کو پروان چڑھایا بلکہ سائنسی نقطۂ نظر کو دوسرے علوم و فنون پر بھی غالب کردیا اور انہیں لادینیت بلکہ دین دشمنی کے رنگ میں رنگ دیا۔

مدیر کے نام

البرہان کے اجراء پر مبارکباد کے پیغامات کا سلسلہ جاری ہے گوجرانوالہ سے مولانا زاہد الراشدی صاحب، اسلام آباد سے مقتدرہ قومی زبان کے صدرنشین جناب افتخار عارف صاحب، جوہرآباد سے معروف مصنف جناب عبدالرشید ارشد صاحب، لاہور کے کتاب جُو جناب شبیر میواتی صاحب، اور تعلیمی ریفارمر جناب جہانگیر محمود صاحب، مولانا اسرائیل صاحب (مانسہرہ)، ڈاکٹر انعام اللہ صاحب (اٹک)، عبداللہ صاحب (خوشاب)، بلال اسلامک سنٹر (وہاڑی) کے اللہ داد نظامی صاحب، چنیوٹ سے جناب آفتاب عروج صاحب، اور فضل کریم بھٹی صاحب (راولپنڈی) وغیرھم نے فون اور خط کے ذریعے مبارکباد دی۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب (مدیر اعلیٰ ماہنامہ القاسم و مہتم جامعہ ابی ھریرہ) نے ہمارے کہے بغیر القاسم کے بیک ٹائٹل پر البرہان کے اجراء کا اشتہار شائع فرمایا اور جناب مجیب الرحمن شامی صاحب نے البرہان کے مضامین میں خصوصی دلچسپی لی۔

☆ کئی دنوں سے آپ بہت یاد آرہے تھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ کہاں ہیں اور کس غار میں امام غائب بن کر چھپ گئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ میری کرامت ہے یا آپ کی ولایت کہ کل

'البرھان' آیا اور آپ کے متعلق علم ہوا کہ آپ کن معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔

البرہان دیکھ کر اور پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ اگست ۲۰۱۰ء کا رسالہ ہے اور ما شاء اللہ آغاز نہایت عمدہ ہے۔ اس کے تمام مندرجات علمی، تحقیقی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں مجلّے کا بہت اچھا نام ہے اور ان شاء اللہ اس کا دائرہ اشاعت بہت وسیع ہوگا۔ لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔ آپ استقلال اور دلجمعی سے کام کرتے رہیں۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

محمد اسحاق بھٹی
(محقق، ادیب اور مصنف کتب کثیرہ)

☆ تعلیم کو اس کے صحیح خدوخال کے ساتھ مقصدیت میں ڈھالنے کی جدوجہد میں معروف احباب کے لئے البرہان ایک مشعل راہ ہے۔ امید ہے کہ یہ آئندہ بھی اسی آب وتاب سے تعلیمی صحافت کے اُفق پر چمکتا رہے گا۔

ظفر اقبال بلوچ
(جنرل سیکرٹری شان اسلام تعلیمی پراجیکٹ، گلبرگ لاہور)